رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

شوال المکرم ۱۳۷۰ھ	جلد ۳۶	عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے	اس پرچہ کی قیمت بارہ آنے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	ربیع الاوّل ۱۳۷۲ھ ۔ مطابق دسمبر ۱۹۵۲ء	جلد ۳۹

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپواکر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِشارات

خلافتِ راشدہ کے سقوط کے بعد دین و سیاست کی تفریق مسلم معاشرے پر جس رفتار سے اثر انداز ہوتی گئی، اسی رفتار سے ملت اہلِ دنیا اور اہلِ مذہب کے دو گونہ عناصر میں بٹتی گئی۔ لیکن جب تک مسلمانوں کی اپنی حکومتیں برقرار رہیں، یہ عناصر ایک دوسرے کے ساتھ لگے رہے۔ دورِ حاضر میں جب مغربی اقوام کی تاخت نے مسلم سلطنتوں کا خاتمہ کر کے اپنے امپیریلیسٹ اقتدار قائم کیے تو اہلِ دنیا اور اہلِ مذہب دونوں بٹ کر نہ صرف الگ الگ ہو گئے، بلکہ دونوں کا ارتقاء بالکل متخالف سمتوں میں ہوا۔ ایک نے تمام مذہبی اصولوں کو قربان کر کے دنیوی فوائد کو سمیٹا، اور دوسرا عنصر مذہب کی بچی کھچی قدروں کو سینے سے لگا کر حجرہ نشین ہو گیا۔

ان دونوں کے درمیان جو خلیج موجود تھی وہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

لیکن اب جو مسلم ممالک غیر ملکی تسلط سے نکل کر آزادی کی سطح پر آ رہے ہیں، اُن کے لیے معاشرہ کا ان دو متخالف عناصر میں بٹا ہوا ہونا ایک انتہائی نازک اور فوری طور پر قابلِ حل مسئلہ ہے! آزادی پانے کے بعد ہر جگہ قدرتی طور پر معاشرہ کی تعمیرِ نو کا سوال اُبھر آیا ہے اور معاشرہ کو کسی بھی نئے نقشے پر تعمیر کرنے کا کام پوری قوم کے تعاون کے بغیر کبھی بخیر و خوبی سرانجام نہیں پا سکتا۔ یہی مسئلہ پاکستان کے سامنے بھی پوری اہمیت کے ساتھ ہے!

جماعت اسلامی برعظیم ہند و پاک میں وہ پہلی جماعت ہے جس نے تعمیر کا وقت آنے سے پہلے ہی معاشرے کے ان دونوں عناصر کو خالص اسلامی اصولوں پر جمع کرنے اور ان کے درمیان وسیع ہوتی ہوئی خلیج پر پل بنانے کی قابلِ ذکر خدمت انجام دی ہے۔ یہ جماعت چونکہ اول روز سے ایک اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست کی تعمیر کا منصوبہ لے کے اٹھی تھی اور اسی کے لیے ملت کی فکری و عملی طاقتوں کو منظم کر رہی تھی اس لیے ناگزیر تھا

کر یہ معاشرے کے دونوں ہی طرح کے عناصر میں نفوذ کرے اور دونوں کو ایک صف میں جمع کر دے۔ خوش قسمتی سے اسے داعیٔ اوّل ملا تو ایسا کہ جس نے دونوں طرف کے سرچشمہ ہائے علوم سے بھی استفادہ کیا تھا اور دونوں عناصر کو قریب سے سمجھا بھی تھا۔ چنانچہ وہ بالفاظ خویش "بیچ کی راس کا ایک آدمی" تھا۔ پھر اس کی آواز پر دونوں طرف سے جو لوگ آگے بڑھے ان کی کچھ تو فکری ساخت ایسی تھی اور کچھ ان کی تربیت اس طرح ہوتی گئی کہ ان کی مجموعی قوت قوم کے مذہبی اور جدید عنصر کو باہم قریب تر لانے کا ایک مؤثر ذریعہ بن گئی۔ جماعت اسلامی نے اسلام کی خالص اور بے آمیز دعوت کو پیش کرنے کے لیے ایک ایسی زبان، ایک ایسا طرز استدلال، ایک ایسی تکنیک اختیار کی جو اپنی روح کے اعتبار سے براہِ راست قرآن کے عین مطابق تھی اور دوسری طرف وہ جدید عنصر کے ذہن سے اقرب بھی تھی۔ اُس نے اپنی دعوت کے لیے خطابت، صحافت اور لٹریچر میں بالکل نئے راستے نکال لیے۔ اُس نے مذہبی عنصر اور جدید عنصر دونوں کو اپنے لیے یکساں مخاطب سمجھ کر جو آواز بلند کی، اس طرح بلند کی کہ وہ دونوں کے لیے قابلِ فہم اور مؤثر ہو۔ اُس نے دونوں طرف کی اصطلاحات کو متقابلاً استعمال کر کے دونوں ہی طبقوں کے لیے ان کو قابلِ فہم بنا دیا۔ اُس نے ایک طرف دین کو تمام ٹکنیکل بحثوں سے الگ کر کے ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے نکھار کر سامنے رکھ دیا اور دوسری طرف جدید ترین مسائل اور زمانے کے آخری تقاضوں کو زیر بحث لا کر یہ واضح کر دیا کہ یہ مسائل اور تقاضے ایسے نہیں ہیں کہ اسلام کے اصول ان کا سامنا نہ کر سکیں۔ چنانچہ اس کی دعوت نے دونوں طرف یکساں قلوب کو فتح کیا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد پاکستان کے مقصدِ وجود کو پورا کرنے کے لیے جب اس جماعت نے مطالبۂ نظامِ اسلامی کا قدم اٹھایا تو یہ معاً برسرِ اقتدار طاقت کی معتوب بن گئی۔ برسرِ اقتدار طاقت چونکہ اس مطالبہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر تیار نہ تھی اور نہ اس کی یہ توقعات پوری ہو سکیں کہ پروپیگنڈے کے زور سے یہ مطالبہ غبار بن کے ہوا میں اُڑ جائے گا، لہٰذا اُس نے محسوس کر لیا کہ ایک کشمکش کا چیلنج اس کے سامنے ہے۔ اس چیلنج کا رُو در رُو ہو کر جواب دینے کے لیے جب کوئی کامیاب تدابیر قابلِ عمل نہ معلوم ہوئیں تو ایک خاص سازش

اس مقصد کے لیے بنائی گئی کہ جدید طبقے کو جو موجودہ نظام تمدن کو چلا رہا ہے، دعوتِ اسلامی کی دسترس سے نکال لیا جائے اور اس کو ساتھ لے کر آئندہ مراحل سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت اختیار کی جاسکے۔

یہ کوشش مطالبے کے ظہور کے ساتھ ہی ساتھ درپردہ شروع کر دی گئی۔ سرکاری عہدہ داروں اور مختلف محکموں کے افسروں کو نہ صرف جماعت کے خلاف ڈرانے سرکلر جاری کر کے متوحش کیا گیا بلکہ زبانی چرچا کیا گیا کہ یہ ایک خطرناک ملائی تحریک ہے جو دورِ جدید کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے چودہ سو سال پہلے کا تمدن بالجبر مسلط کر دینا چاہتی ہے۔ پھر آگے چل کر یہ مہم برسرِ عام بھی چلائی گئی۔ اور اس میں برسرِ اقتدار طبقے کے ساتھ کمیونسٹ ملاحدہ، منکرینِ حدیث اور مسلمانوں میں شمار ہونے والے ان تمام لوگوں نے اپنا اپنا حصۂ محنت شامل کر دیا جو اندر سے تبدیلِ دین کر چکے تھے۔

آج جبکہ دستوری جدوجہد پورا پورا زور پکڑ چکی ہے، اچانک بڑی محنت سے لکھی ہوئی یا لکھوائی ہوئی ایک کتاب پبلک کے سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب بڑے اونچے اشاعتی معیار کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور جدید طبقے خصوصاً سرکاری افسروں، ایڈیٹروں اور اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں میں بلاقیمت تقسیم کی جا رہی ہے۔ ایک صاحب کو تو خود ایک مرکزی وزیر صاحب نے بنفسِ نفیس اپنے دستِ مبارک سے ہدیۃً پیش کی ہے۔ اس کتاب کا منشا بجز اس کے کچھ نہیں کہ جماعت اسلامی کے خلاف، جہاں مختلف بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا غبار اڑایا جائے، وہاں اس پر ملائیت کا ٹھپہ لگا کر جدید عنصر کو تعصب میں مبتلا کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اخبارات میں ایک ہی انداز کے لکھے ہوئے مضامین کا ایک ایسا طوفان امڈ پڑا ہے جو دستور کے مسئلے میں عوام کو پریشان کرنے کے علاوہ علمائے دین کے خلاف جدید عنصر میں متعصبانہ نفرت پھیلانے والا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کوئی معشوق ہونا چاہیے۔ ہم اس معشوق کو پہلے سے جانتے تھے، مگر وہ اُس روز پوری طرح کھل کر عوام کے بھی سامنے آگیا جس روز ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے پشاور کے اسلامیہ کالج میں تقریر کرتے ہوئے پورے زعمِ اقتدار کے ساتھ فرمایا کہ ہم ملا کو برسرِ اقتدار نہیں آنے دیں گے[۱]۔

---

۱ مگر سوال تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ کی اتھارٹی کیا ہے کہ اگر قوم کسی کو اپنی آراء سے آگے لانا چاہے تو آپ نہیں آنے دیجئے۔

یہ عظیم الشان مگر خطرناک مہم جو وزیروں اور بعض لیڈروں، ایڈیٹروں اور ادیبوں نے مل کر اب تک چلائی ہے، اگرچہ تحریک اسلامی کے نشوو ارتقاء کا راستہ روک نہیں سکی، تاہم اس نے جدید عنصر (خصوصیت سے اپر مڈل کلاس) پر اثر ضرور ڈالا ہے۔ وہ باتیں جو کسی حد تک تحریروں سے، اور بیشتر نجی گفتگوؤں کے ذریعے پھیلائی گئی ہیں، حسب ذیل ہیں :-

——— اسلامی دستور کا مطالبہ محض چند ملاؤں کا مطالبہ ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ موجودہ کارفرما جدید عنصر کو پیچھے ہٹا کر ملاؤں کو برسر اقتدار لایا جائے۔

——— جس اسلامی نظام کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اس کے پیچھے مولویوں کی ایک پولیس اسٹیٹ کا تصور کام کر رہا ہے یعنی، لوگوں پر تازیانوں اور کوڑوں کے زور سے ایک نامرغوب تبدیلی مسلط کر دی جائیگی تبدیلی بھی کوئی معنوی اور ٹھوس اور مفید تبدیلی نہیں ہو گی بلکہ یہ کہ جبراً ڈاڑھیاں رکھوائی جائیں گی جبّے اور عمامے لباس میں داخل کر دیئے جائیں گے، بازار زبردستی اونچے اٹھوا دیئے جائیں گے، مار دھاڑ کر کے نمازیں پڑھوائی جائیں گی، وغیرہ!

——— اسلامی نظام میں زندگی پر ہر پہلو سے بے پناہ جکڑبندیاں عائد کر دی جائیں گی۔

——— ملائی حکومت تمام تفریحات کا خاتمہ کر دے گی۔

——— جدید ذرائع و وسائل کو چھوڑ کر یہ لوگ پھر سے قدیم ذرائع و وسائل کی طرف لوٹ جائیں گے مثلاً جہاد کے لیے توپوں اور بموں کو ترک کر کے پھر سے تلواریں سونت لی جائیں گی اور موٹروں اور ہوائی جہازوں کو غیر اسلامی قرار دے کر اونٹوں اور گھوڑوں کا دور واپس لایا جائے گا۔[1]

——— جدید مسائل سے قطع نظر کر کے صدیوں پرانی فقہ کو بطور قانون نافذ کر دیا جائے گا۔

——— اندھا دھند سارے کا سارا موجودہ نظام چوپٹ کر کے رکھ دیا جائے گا۔

---

[1] آپ حیران نہ ہوں کہ کیا فی الواقع ایسی یاوہ گوئی کے لیے کوئی بنیاد بھی کسی کو مل سکتی ہے۔ جی ہاں! ایک اچھے خاصے ترقی پسند ادیب نے نظام اسلامی کے خیالی نقشے پر اسی طرح کا رنگ بھر کے دکھایا ہے۔

اندازہ کیجیے کہ اس طرح کے پروپیگنڈے کے نتیجے میں اسلام جدید عنصر کے لیے جو اس سے براہِ راست واقف نہیں ہے، کتنا خوفناک ہوّا بنایا جا رہا ہے۔ یہ ہوّا دکھا دکھا کر اور پھر اسلامی نظام کی آواز بلند کرنے والے ہر فرد اور گروہ پر "ملّا" کی گالی پوری شانِ حقارت کے ساتھ چسپاں کر کر کے اندر تو اس خلیج کو کتنا وسیع کیا جا رہا ہے جسے پاٹنے کے لیے آج ہمہ جہتی محنت کی ضرورت ہے!

اس سازش کا مقابلہ کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ اس پروپیگنڈے کا سخت مقابلہ کیا جائے اور قوم کے تعلیم یافتہ طبقے کو جھوٹ اور فریب کے اس غبار سے باہر نکال کر اصل حقیقت کے سامنے لا کھڑا کیا جائے۔ اسی مقصد کے تحت ہم اس صحبت میں اس طبقے سے براہِ راست خطاب کرنا چاہتے ہیں۔

یاد رکھیے کہ ایسا ہونا سرے سے ممکن نہیں ہے کہ کسی معاشرے کے ایک قلیل سے عنصر کی محض اپنی تمنائے اقتدار عوامی تحریک بن سکے۔ عوامی تحریک ہمیشہ کسی ایسے عوامی محرک کے بل پر کھڑی ہوتی ہے جو پورے معاشرہ کے ذہنی پس منظر میں ایک تاریخی عامل بن کر کام کر رہا ہو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ملک کے پورے کے پورے عوام مطالبۂ نظامِ اسلامی کے ہمنوا بن کے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور آج پشاور سے ڈھاکہ اور ڈھاکہ سے کراچی تک ایک ہی آواز ہے کہ جو لہریں لے رہی ہے۔ یہ تحریک ٹھیک پاکستان کی تحریک کی طرح ہمہ گیر بنتی جا رہی ہے، اور یہ تحریک پاکستان کی تحریک کا تتمہ ہے۔ خوب سمجھ لیجیے کہ یہ محض چند ملّاؤں کے وعظوں کا کرشمہ نہیں ہے اور نہ تاریخ انسانی میں اس طرح ہتھیلی پر سرسوں جمائی جا سکتی ہے۔ اس عوامی مطالبہ کی جڑیں بڑی گہری ہیں، اور بہتر ہو گا کہ آپ ان جڑوں کا گہرا جائزہ لیں۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے مسلمان بحیثیت ایک ملّت کے ہمیشہ سے یہ ایک چبھتا ہوا احساس رکھتے ہیں کہ جو کچھ ان کو ہونا چاہیے، وہ اب وہ نہیں رہے ہیں، اسلام کے اصولوں پر ان کا معاشرہ استوار نہیں ہے اور ان کا نظامِ زندگی وہ نہیں ہے جس کا نقشہ قرآن نے پیش کیا تھا۔ مسلمان کہلاتے ہوئے اسلام سے منحرف ہو کر زندگی بسر کرنا ایک ایسا نمایاں اور زندگی گیر تضاد ہے کہ جس نے ہمیشہ اُن میں وہ بے چینی کی حِس پیدا کی ہے جس سے تبدیلی کے ذوق کے سوتے پھوٹا کرتے ہیں۔

چنانچہ تاریخِ امت میں بار بار اس حس نے ایسی قوتوں کو ابھارا ہے جنہوں نے غیر اسلامی معاشرتی ماحول اور اس کی پاسبانی کرنے والے اقتداروں سے ٹکر لی ہے۔ یہ حس بڑی تاریخی حس ہے۔ یہ ایک مستقل حس ہے اور اس کی آبیاری بڑے بڑے ائمہ و صلحا نے اپنی قربانیوں سے کی ہے۔ یہ اتنی گہری حس ہے کہ نہ اپنوں کی ملوکیت اور جباری اس کا خاتمہ کر سکی اور نہ غیر ملکی طاقتوں کی ساحری و سامری اس کی جڑیں اکھیڑنے میں کامیاب ہو سکی۔ یہ حس وہ طاقتور حس ہے کہ جس نے برّعظیم ہند و پاک کے مسلمانوں کی ہر تحریک میں اپنے ظہور کے لیے راستے نکالے ہیں۔ تحریکِ خلافت ہو یا جمعیت العلماء، مجلسِ احرار ہو یا تحریکِ خاکساراں، ہر ایک کے اندر یہ دل بن کے دھڑکی ہے۔ اور تو اور، خود تحریکِ پاکستان کی گرماگرمیاں اس تاریخی حس کی وجہ سے تھیں اور اسلامی نظامِ زندگی ہی کا بلاوا وہ بلاوا تھا جس نے جمود زدہ مسلمانوں کے خون کو گرم اور ارادوں کو جوان کر دیا اور ان کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔

پھر یہ تاریخی حس وہ بلا کی قوت ہے کہ جو ہمارے پورے لٹریچر کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اردو زبان میں گذشتہ دو صدیوں کے مسلم لٹریچر کی تعمیر میں جن جن کی خدمات کا حصہ ہے، وہ شعوری یا نیم شعوری طریق سے بہر حال ہماری اسی ملی حس کی تسکین و آبیاری کا سامان کرتے رہے ہیں۔

اس حس کو نہ کھرچ کر ملت کے ذہن سے الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو نظر انداز کر کے کوئی قدم کامیابی سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ بخلاف اس کے جو طاقت اور جو عنصر بھی اس حس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اٹھے گا، وہ جب بھی اٹھے رائے عام کو ساتھ لینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ چنانچہ یہی آج ہو رہا ہے۔ تحریکِ نظامِ اسلامی چند ملاؤں کے وعظوں کا ظہور نہیں ہے، بلکہ وہ اس تاریخی قوت[1] (Historical force,) کا ظہور ہے۔ جو لوگ اس تاریخ کو ملاؤں کی تحریک سمجھ کر اسے مذاق

[1] یہ تاریخی قوت آج پاکستان ہی میں نہیں، قریب قریب سارے ہی اسلامی ممالک میں ابھر رہی ہے۔ شروع شروع میں مغربی تہذیب کی یورش نے اسے کسی قدر دبا لیا تھا، لیکن اب جبکہ اس تہذیب کی چمک دمک کے پیچھے چھپے ہوئے مفاسد خوب نمایاں ہو گئے ہیں اور خود مغرب ہی کے علماء و مفکرین اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے لگے ہیں، مشرق کی آنکھوں سے بھی مرعوبیت کے پردے ہٹ رہے ہیں اور اب مسلمان ملکوں کی نوجوان طاقت اسلامی تحریک کی علمبردار بن کر میدان میں آ رہی ہے۔

میں اڑانے کی، یا اسے بادِ ہوائی چیز سمجھ کر نظر انداز کرنے کی غلطی کریں گے، ان کو بہت ہی جلد اپنے جائزے کی کوتاہی کا اندازہ ہوجائے گا ۔ پس ہم اپنے تعلیم یافتہ طبقے سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ حالات کا مطالعہ کرنے میں گہرے غور و فکر سے کام لیں، اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے آپ کو غلط اندیش لوگوں کے حوالے نہ کریں۔ ورنہ اگر ایسا ہوا کہ ملک کی عوامی طاقت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے، اس کی امنگوں کے خلاف آپ نے چند اقتدار یافتہ افراد کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تو آپ کو ابھی سے سوچ لینا چاہیے کہ جمہوری نقطۂ نظر سے ایک اقلیت ہوتے ہوئے آپ کب تک رائے عام کو کچل کر زندگی کی راہ پر اقدام کر سکیں گے ؟

اسلامی نظام کے قیام کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جس روز اس کی صبح نمودار ہوگی تو آج جو لوگ نظامِ تمدن و حکومت کو چلا رہے ہیں ان کو معاً برطرف کر کے ان کی جگہ تلاش کر کر کے ایسے اشخاص کو لا بٹھایا جائے گا جن کے چہروں پر ڈاڑھیاں ہوں اور جو جبہ و عمامہ سے آراستہ ہوں۔ کسی مسجد کے مولوی کو ڈپٹی کمشنر، کسی جامع کے خطیب کو گورنر، کسی عربی مدرسے کے مدرس کو ڈائرکٹر اور کسی دارالافتاء کے مفتی کو ہائی کورٹ کا جج بنا کے بٹھا دیا جائے گا۔

یہ مخالفانہ پروپیگنڈے کے بنائے ہوئے ہوّے ہیں، براہِ کرم ان سے ڈر کر مضحکہ نہ بنیے! ہم آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ تمدن و سیاست کا نظام آج جو ہاتھ چلا رہے ہیں ان کے تعاون کے بغیر مستقبل کا کوئی نظام بھی نہیں چل سکتا۔ آخر جن لوگوں نے اجتماعی نظام کی مشینری کو چلانے کی تربیت پائی ہے اور جن کام کر کے اس کا تجربہ حاصل کیا ہے اُن کو پیچھے ہٹا کر کوئی بھی تحریک اناڑیوں کو بڑی بڑی ذمہ داریاں کیسے سونپ سکتی ہے۔ یہی دماغ اور یہی ہاتھ جو آج نظامِ زندگی کو چلا رہے ہیں، انہی کو کل بھی چلانا ہے۔ بجز ایسے ناکارہ عنصر کے جو اسلامی نظامِ زندگی کا کارکن بننے کے لیے فکر و عمل کے لحاظ سے اصلاح کی کوشش کے باوجود اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کرنے پر تیار نہ ہو۔ اور آخر دم تک وہ اس کی مزاحمت کرتا چلا جائے۔

اسی لیے یہ ضروری ہے کہ ہماری موجودہ کارکن طاقت، ابھی سے اسلام کو سمجھنے اور اس کے مطابق

اپنے طرزِ عمل کو سازگار بنانے پر متوجہ ہو جائے۔

دنیا کا کوئی بھی نظام ایسا نہیں ہے جو مجرد قانون کے ڈنڈے کے بل پر چل سکتا ہو۔ قانون کسی معاشرہ کے بناؤ میں منفی پہلو سے حصہ دار ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مجرد منفی پہلو سے ایک نظام کے قیام و نفاذ کا اہتمام کرنے پر اکتفا کرنا ایک کھلی کھلی حماقت ہے۔ نظام اصلاً تعلیم و تربیت (یہ اصطلاح ہم وسیع معنوں میں استعمال کر رہے ہیں) کی مثبت تدبیر کے بل پر چلتے ہیں۔ تعلیم و تربیت سے مطلوبہ نقشے پر افراد تیار ہوتے ہیں، تعلیم و تربیت سے اجتماعی ذہن بنتا ہے اور تعلیم و تربیت ہی سے معاشرتی ماحول تیار ہوتا ہے۔ قانون کی منفی تدبیر کی ساری اہمیت یہ ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کی مثبت مہم کے راستے سے رکاوٹیں دور کرے، وہ موانعات کا ازالہ کرے، اور وہ اُن عناصر کے پنپنے کو روک دے جو تعلیم و تربیت کے سانچے میں کسی طرح ڈھل کر نہ دیں۔

ہمارے نزدیک قانونی جبر کو زندگی کے کسی گوشے میں استعمال کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مخالف قوتوں کو دلیل کے میدان میں شکست دے لی جائے، ورنہ تاریخ گواہ ہے کہ ان قوتوں نے کسی بہتر سے بہتر قانون کو کبھی نہیں چلنے دیا۔ کوئی نظام اپنے خلاف کام کرنے والی فکری و استدلالی قوتوں سے پوری طرح ہتھیار رکھوائے بغیر اگر محض قوت کے استعمال سے پنپنا چاہتا ہے تو قدم قدم پر اس کا راستہ وہ فکری و استدلالی قوتیں روکتی ہیں، یہاں تک کہ وہ اسے بالکل زچ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ قانون کی قوت دلیل کی قوت کو کبھی شکست نہیں دے سکتی۔ دلیل کی قوت کو دلیل ہی کی قوت توڑ سکتی ہے اور اس معرکے کے لیے تعلیم و تربیت کی مہم چلانا نفاذِ قانون کے مقابلے میں اولیت رکھتا ہے۔

کسی قسم کی بھی قانون سازی سے پہلے ہمارے نزدیک اس قانون کا احترام کرنے والی رائے عام کی تخلیق و تربیت کی ضرورت ہے۔ جوں جوں فضا تیار ہوتی جائے، قانون سازی کا قدم آگے آگے اُٹھتے جانا چاہیے۔ پہلے اکثریت کو کسی مقصد کے لیے ہم آہنگ کیا جانا چاہیے اور پھر اس مقصد کے تحفظ کے لیے قانونی تدابیر کو عمل میں لایا جانا چاہیے۔

مولویوں کی پولیس اسٹیٹ اور ملاؤں کی ڈکٹیٹرشپ چلانے کا الزام تحریک اسلامی پر عاید کرنے والوں کو چاہیے یہ تھا کہ وہ پہلے "۲ نکاتی مطالبے" ہی کا جائزہ لے کر دیکھتے کہ جس نظام میں پوری پوری شہری آزادیوں کا دستوری تحفظ پیش نظر ہے، جس میں عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ رکھا جا رہا ہے، جس میں انتظامیہ اور مقننہ کے اقدامات کو عدالت میں چیلنج کرنے کی گنجائش چھوڑنا پیش نظر ہے، اور جس میں اصولِ انتخاب کو بنیادی اہمیت دی جا رہی ہے، اس میں آخر کسی پولیس اسٹیٹ اور کسی ڈکٹیٹرشپ کے قیام کا راستہ کدھر سے کھلا رہ جاتا ہے؟ پھر ان حضرات کو چاہیے تھا کہ یہ تحریک اسلامی کو چلانے والی منظم طاقت کی داخلی تنظیم اور اس کی دستوری ہیئت کا جائزہ لیتے کہ جس جماعت میں تمام مناصب انتخابی ہیں، جس میں سارا کام جماعت کے مشورے سے عمل میں آتا ہے، جس میں ارکان اپنے امرا کو معزول کر سکتے ہیں، جس میں تنقید کی سو فیصدی آزادی افراد کو دی گئی ہے اور جس میں امیر اور شوریٰ کے اختلاف کی صورت میں فیصلہ کن طاقت پورے ارکان کو قرار دیا گیا ہے، کیا ایسی ہی تنظیموں کے ہاتھوں ڈکٹیٹرشپ اور پولیس اسٹیٹ قائم ہوا کرتی ہے؟

کیا ایسے اندھے اور جاہلانہ پروپیگنڈے سے ملک کے تعلیم یافتہ عنصر کو متاثر ہونا چاہیے؟

کہا جاتا ہے کہ چند سطحی تغیرات سے زیادہ اسلامی نظام کی اسکیم میں کوئی شے شامل نہیں ہے ہم پوچھتے ہیں کہ جماعت اسلامی نے صوبۂ پنجاب اور صوبۂ سرحد کے انتخابات میں شرکت کرتے ہوئے جو منشور دیا تھا کیا اسے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح آج ٹریفک کنٹرول کے لیے چوکوں پر سپاہی کھڑے ہو کر ڈیوٹی انجام دیتے ہیں، کل اسی طرح محکمۂ احتساب کے کارندے سڑکوں پر کھڑے ہو کر ہر اس شخص کی پیٹھ پر تازیانے برسا دیں گے جس کے ڈاڑھی نہ ہو گی یا جو کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہو گا، اور ہر اس شخص کا چالان کر دیں گے جس کے لباس میں ایک عربی جبہ اور حاجیوں کا رومال شامل نہ ہو گا، اور قینچی لے کر ہر اس پاجامے اور شلوار کے پائنچے کاٹ ڈالیں گے جو ٹخنوں کو چھوئے؟

خدا کے انبیاء اصلاً جس کام کے لیے آئے ہیں وہ یہ ہے کہ خدا کے بندے خدا کے سوا کسی کی مرضی

اور کسی کے قانون کے سامنے جھکنے پر مجبور نہ ہوں، وہ معاشی حیثیت سے کسی کے ظلم کا شکار ہو کر اس فطری توازن کی برکات سے محروم نہ ہوں جو اللہ تعالیٰ کو زندگی میں مطلوب ہے، وہ اخلاقی لحاظ سے ان قدروں سے آراستہ ہوں جو ہمیشہ انسانیت کے ارتقا کا وسیلہ بنی ہیں اور ان کو فحشاء و منکر کے ان تمام حملوں سے محفوظ کیا جائے جو جوہر انسانیت کے لیے ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔

باقی رہے وضع قطع اور آداب و اطوار، تو یہ ایک معاشرے میں فطری طور پر ان اصولوں، خیالات، مقاصد، اور جذبات کے تقاضوں کے مطابق پروان چڑھتے ہیں جو کسی معاشرے میں من حیث المجموع نافذ ہو جائیں۔ ان کے لیے قانون اور پولیس کی طاقت کو کبھی کسی نے استعمال نہیں کیا۔ انگریزی اقتدار نے بھی آداب و اطوار کو بغیر کسی جبر کے بدل دکھایا تھا اور اسلامی نظام بھی آئے گا تو نئے آداب و اطوار اس کے نتیجے کے طور پر خود بخود نشو و نما پائیں گے۔ اصل ہم زندگی کی بنیادی قدروں اور نظام زندگی کی اساسات کو بدلنے کی پیش نظر ہے، باقی چیزوں کو یہ تبدیلی خود بخود درست کر دے گی۔

پروپیگنڈے کا اگلا اٹھایا ہوا بھی بہت خوفناک ہے کہ زندگی بے شمار جکڑ بندیوں میں مبتلا ہو جائے گی۔ حالانکہ اسلام میں "حلال" کا دائرہ بے حد و نہایت وسیع ہے اور "حرام" کا رقبہ نہایت محدود۔ ممنوعات کی فہرست بڑی مختصر ہے اور مباحات کا میدان کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ پابندیاں بالکل معمولی اور گنتی کی ہیں اور آزادی کی جولانگاہ دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مثلاً کھانے پینے کے معاملے میں گنتی کی چند چیزیں حرام کرنے کے بعد باقی میدان کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں کوئی مذہبی ڈریس اور حدودی مقرر نہیں ہے کہ لازماً ہر شخص اسے پہننے پر مجبور ہو بلکہ پابندی ہے تو صرف اتنی کہ لباس ساتر ہو، اسراف اور کبر کے مظاہر سے پاک ہو اور کسی خاص گروہ کی نقالی اور بد نوارگی نہ رکھتا ہو۔ ان حدود کی پابندی کے بعد آپ آزاد ہیں کہ جس طرح کا کپڑا چاہیں استعمال کریں اور جس فیشن اور جس تراش کو چاہیں اپنے لیے پسند کریں۔

اسی طرح ہر شعبۂ زندگی میں اسلام نے تھوڑی سی حدود عائد کرنے کے بعد آدمی کو کھلی چھوٹ دے دی ہے کہ وہ زمانے ملک اور موسم کے تقاضوں اور اپنے ذوق کے مطالبوں کے مطابق جس طرح چاہے زندگی

بسر کرے۔ یہ ذرا سی پابندی حدود در حقیقت اس کی وسیع آزادی کے تحفظ کے لیے ہے۔ کوئی اسلامی حکومت بے جا ضابطہ بندی (Codification) کی پالیسی اختیار کر کے، بغیر کسی اہم اجتماعی مصلحت کے افراد کی آزادیوں کو جکڑ بند نہیں کر سکتی۔

پس یہ ہوا محض خیالی ہوا ہے، کسی ہوشمند کے لیے اس سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں!

اسلامی نظام کے بارے میں یہ بھی ایک جھوٹا پروپیگنڈا ہے کہ وہ زندگی کو تفریح سے خالی کر کے رکھ دیگا۔ واقعتہً اسلام میں تفریحات پر کسی قدر قدغن ہے، مگر صرف ایسی تفریحات پر ہے جو اپنے نتائج کے اعتبار سے انسانی معاشرے کے لیے ہمیشہ مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ شراب کو ذریعۂ تفریح نہ بننے دیگا، لیکن کافی، چائے، شربت اور دوسرے پاکیزہ مشروبات پر اس نے کوئی قید عائد نہیں کی۔ وہ آپ کو نامحرم عورتوں سے تفریح حاصل کرنے سے روکے گا، لیکن آپ دائرہ نکاح میں جی بھر کے تفریح کر سکتے ہیں۔ وہ آپ کو قمار کے کھیلوں سے روکتا ہے، لیکن آپ دوسرے میدانی اور خانگی جو کھیل چاہیں کھیلیں، اسلامی احکام ان میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ وہ آپ کو اس سینما سے بھی محروم کردے گا جو آپ کو فحشا و منکرات کا سبق دیتا ہے لیکن دوسری طرف اگر آپ اس سینما کو ایسی تفریح کا ذریعہ بنائیں جو تعلیم و تربیت کے تقاضے بھی پورے کرے تو وہ اس سے استفادہ کرنے میں آپ کے لیے مانع نہیں ہوگا۔ وہ بلاشبہ آپ کو مخلوط مجالس کی ناپاک تفریح کی آزادی نہیں دیتا لیکن جداگانہ مجالس تفریح کو اس نے کبھی حرام قرار نہیں دیا۔ وہ دوسروں پر استہزاء کرنے کی تفریح کو یقیناً کراہت سے دیکھتا ہے لیکن اس نے چہروں کو مسکراہٹوں سے محروم کرنے کے لیے کبھی کوئی اقدام نہیں کیا ہے، بلکہ آنحضور صلعم نے فرمایا "تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکراہٹ پیش کرنا بھی ایک صدقہ ہے۔" اسلام میں یقیناً آلاتِ موسیقی سے تفریح کو روکا گیا ہے، لیکن شادی بیاہ اور تقاریب پر پاکیزہ گیت گاتے جانے سے، ترنم سے، شعر و شاعری سے، ادبی تخلیق سے، خطابتی کمالات سے اس نے انسانیت کو کبھی محروم کرنے کی سعی نہیں کی۔ تفریح انسانی زندگی کا ایک فطری تقاضا ہے اور اسلام نے اس کے لیے پوری طرح راستے کھولے

ہیں۔ پابندی اگر کوئی عاید کی ہے تو تفریح کی ان چند صورتوں پر جو اخلاقی لحاظ سے کھلے کھلے مفاسد رکھتی ہیں۔

کوئی نظامِ ریاست، اس کے اصول چاہے کسی نوعیت کے ہوں، اپنے دور کے ذرائع و وسائل سے قطع نظر کرکے ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتا۔ چنانچہ خود نبی صلعم کے دور میں جب اسلامی نظامِ ریاست قائم ہوا تو دوسری قوموں کے فنونِ جنگ اپنائے گئے، رومیوں سے صف بندی کا طریق اخذ کیا گیا، خندق بنانے کا ایرانی طریقہ اپنایا گیا، اور پھر قرونِ مابعد میں تو مقصد نے مسلمانوں میں قوتِ تخلیق و ایجاد کو ابھار دیا اور وہ منجنیقوں اور دبابوں کی نئی نئی اقسام ایجاد کرکے زمانے کی بڑی بڑی قوموں پر چھا گئے۔

آخر خدا نے اپنے انبیاء اور اپنی کتب کو اس مقصد کے لیے تو نہیں بھیجا ہے کہ ایک خاص ملک اور زمانے کے تمدن پر تاریخ کو روک کر ہمیشہ کے لیے کھڑا کر دیا جائے کہ بس یہاں تک تو جو ایجادات ہوتی رہی تھیں وہ "اسلامیائی" جاتی ہیں اور اس کے بعد جو ذرائع و وسائل ظہور پذیر ہوں گے وہ سب غیر اسلامی قرار دیئے جاتے ہیں۔ بس اب ہمیشہ کے لیے لڑائی کا ہتھیار تیر کمان، تلوار اور نیزہ ہوں گے اور سواری صرف گھوڑوں اور اونٹوں پر کی جائے گی۔

یاد رکھیے کہ فطرت کی ساری قوتیں، اور تمام کی تمام مادی ایجادات اصلاً بندگیٔ رب اور خدمتِ حق میں ممد ہونے کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ تو ان قوتوں اور ایجادات کی بدقسمتی ہے کہ یہ بری طاقتوں کے ہاتھوں میں آکر برے مقاصد کی خادم بن گئی ہیں۔ اب اگر اسلام ایک طاقت بن کر نمودار ہوتا ہے تو سب سے بڑھ کر اسی کو حق پہنچتا ہے کہ ان کو اپنے پاکیزہ مقاصد میں استعمال کرے۔

اسلام اور کفر کی تفریق اصول و مقاصد میں ہوتی ہے، نہ کہ ذرائع و وسائل میں! ایک ہی ذرائع و وسائل کفر کے ہاتھوں میں جاکر اس کے آلۂ کار بن جاتے ہیں اور وہی اسلام کے ہاتھوں میں پہنچ کر اس کے اسلحۂ جنگ بن جاتے ہیں! ان پر کسی کا اجارہ نہیں، بلکہ جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے!

موجودہ ذرائع و وسائل تو کجا، اگر ایک اسلامی ریاست کو اس دور میں چلنا ہے تو تسخیر قوائے فطرت اور ایجادِ ذرائع و وسائل میں اسے دوسری قوموں سے اپنا قدم آگے بڑھانا ہوگا۔

پرانی فقہ اگرچہ ہمارے جلیل القدر محققین و مفکرین کی محنتوں کے قیمتی نتائج کا ایک بیش بہا خزانہ ہے اور ہم اپنی اس زریں میراث کو دریا برد کر کے اگر آگے بڑھیں گے تو ہم سے زیادہ احمق کوئی نہ ہوگا، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت اپنی جگہ قابل لحاظ ہے کہ ہمارے قانون و فقہ کا علمی ارتقاء ایک مسلسل چلتے رہنے والے اسلامی نظامِ زندگی کے ساتھ ساتھ نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اسلامی نظام کے سقوط کے بعد آہستہ آہستہ اس کا تعلق عملی زندگی کے مسائل سے کٹتا گیا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار صرف مسلمانوں کا پرسنل لاء تھا جو عملاً باقی رہ گیا اور اسی دائرے سے متعلق فقہ کو پڑھا اور پڑھایا جاتا رہا۔ لیکن خود اس دائرے میں بھی اجتہاد کی پیش قدمی رک گئی۔

آج اگر ہم ایک اسلامی ریاست اور اسلامی نظامِ زندگی چلانے کا تہیہ کر کے اٹھیں تو ہمیں اس حقیقت کو مان کر آگے بڑھنا چاہیے کہ ہماری فقہ کا علمی ذخیرہ سیاست، معیشت، معاشرت اور تمدن کے ان جدید ترین مسائل کے چیلنج کا تیار بہ تیار جواب اپنے اندر نہیں رکھتا ہے جو اس کے اجتہادی ارتقاء کے رک جانے کے بعد آہستہ آہستہ نمودار ہو کر پہاڑ جیسے مسائل بن گئے ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتہاد کا ناخن تدبیر ضروری ہے اور آج قدیم فقہ کے علمی ذخیرے سے جو روشنی ہمیں مل سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی اصولوں کے ذریعے نت نئے مسائل کو حل کرنے اور اصولوں کو روزمرہ کے معاملات پر منطبق کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

جس دن عملاً ایک اسلامی نظام برپا ہوگا اُس دن اجتہاد کا دروازہ از خود کھل جائے گا اور کوئی قفل اس پر لگا نہ رہ سکے گا۔ مسائل جب سامنے آئیں گے اور اپنا فوری حل طلب کریں گے تو اجتہاد کے کٹر سے کٹر مخالف بھی مجبور ہو جائیں گے کہ وہ نگاہ کو وسیع کریں اور فکر کو بیدار کریں۔

البتہ یہ واضح رہے کہ اجتہاد اسلام کے اصولوں کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، نہ کہ اُن سے انحراف کرنے کے لیے۔ آج کل یہ اصطلاح چونکہ اس دوسرے معنی میں بھی بولی جاتی ہے اس لیے یہ صراحت ضروری معلوم ہوئی۔

اسلامی نظام کے طریقِ نفاذ کا یہ تصور بڑا ہی مضحکہ انگیز تصور ہے کہ ایک رات کو لوگ موجودہ نظام کے سائے میں سوئیں گے اور صبح اٹھیں گے تو کایا کلپ ہو چکی ہوگی۔ اسکولوں اور کالجوں میں نئے ماسٹر اور

پروفیسر جلوہ گر ہوجائیں گے، عدالتوں میں نئے جج اور وکلا ظہور کریں گے، اسمبلیوں میں نئے وزیر اور ایم ایل ئے نمودار ہوجائیں گے، نصابِ تعلیم اور درسی کتب ایک ہی رات میں نئی چھپ کر تیار ہوجائیں گی، پرانے قوانین کو ایک آرڈر سے منسوخ کرکے یکایک نئے قوانین ان کی جگہ نافذ کردیے جائیں گے، سودی بنکنگ سسٹم کو ایک فیصلے کے ذریعے توڑ دیا جائے گا، سابق ضابطۂ ملازمت بارہ گھنٹے کے اندر اندر منسوخ ہوکر نیا ضابطۂ ملازمت چل جائے گا، سکّہ راتوں رات بدل دیا جائے گا —— اس طرح انقلاب کا ایک احمقانہ نقشہ بنا کر اسلامی نظام کے علمبرداروں پر چپکا جاتا ہے اور پھر اُن کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔

جی نہیں! —— جو لوگ نظامِ اسلامی کا مطالبہ لے کے اٹھے ہیں وہ اتنے کورے نہیں ہیں، انہوں نے ایک وسیع لٹریچر اپنے منصوبے کو واضح کرنے کے لیے مرتب کرکے میدان میں ڈال دیا ہے۔ آپ اگر اسے پڑھیں تو وہ آپ کو بتائے گا کہ اسلامی نظام کی علمبردار طاقت کوئی سر پھری طاقت نہیں ہے۔ اسے اندازہ ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کو بدلنے کے لیے، موجودہ نظم و نسق کو بدلنے کے لیے، موجودہ مالیات اور بنکنگ کو بدلنے کے لیے، موجودہ زرعی نظام کو بدلنے کے لیے کتنی کاوشوں اور پتہ ماریوں اور منصوبہ بند اقدامات کی ضرورت ہوگی۔ مثلاً صرف ایک نظامِ تعلیم کو بدلنے کے لیے جہاں ایک نئے نظریۂ تعلیم اور فلسفۂ تعلیم کو اختیار کرنا ہوگا اور جہاں نصاب کے نقشے بدلنے ہونگے، وہاں اسے چلانے کے لیے نئے اساتذہ تیار کرنے ہونگے، درسگاہوں میں نیا ماحول پیدا کرنا ہوگا اور تمام درجات کے لیے درسیات کی نئی تدوین کی ضرورت ہوگی اور پھر اس سروسامان کے ساتھ نئے تعلیمی تجربات عمل میں لانے ہونگے اور ایک مدت میں ہمارا مطلوبہ نظامِ تعلیم تشکیل پذیر ہوگا۔ اسی طرح اگر ہم قانونی نظام کو بدلنا چاہیں گے تو ہمیں ماہرین کے ذریعے پورے قوانین اور عدلیہ کا جائزہ لینا ہوگا، پھر تبدیلی کا ایک منصوبہ بنا کر اس پر اس طرح اقدام کرنا ہوگا کہ ایک طرف فضا کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ پرانے قوانین منسوخ ہوکر نئے قوانین مدون ہوتے جائیں اور دوسری طرف ماہرینِ قانون کو نئے نقشے پر تیار کرنے کے لیے لاء کالجوں کا نظام بدلے۔ موجودہ لاء کالجوں اور موجودہ ججوں اور موجودہ ماہرینِ قانون کے ہاتھوں میں قرآن اور حدیث کی کتابیں دے کر یکدم تو آپ اسلامی قانون کو نافذ نہیں کرسکتے۔ آہستہ آہستہ اسی چلتے نظام کو نئے نظام میں منتقل کرنا ہوگا۔ یہی حال ہر دوسرے شعبے میں تغیر کو برپا کرنے کا ہے کہ اصولِ تدریج ایک فطری اصول

کی حیثیت سے از اول تا آخر کام کرے گا۔ اگرچہ تدریج کے معنی ٹال مٹول کے نہیں، جیسے کہ ایک گروہ عملاً آج اسی معنی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ بعض مذہبی حضرات پورے کے پورے نظامِ شریعت کو یکبارگی نافذ کرنے کا نقشہ ذہن میں رکھتے ہیں اور پھر ایسے طریق سے اس سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ اسلامی تحریک کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں کو ان کی باتوں سے اچھا خاصا مواد مل جاتا ہے۔ لیکن یہ سب باتیں ہی ہیں جن کو خاموشی سے سن لینا چاہیے۔

بہرحال یہ حقیقت خوب اچھی طرح سمجھ لی جانی چاہیے کہ قوم کی اکثریت اور اس کی پوری عوامی طاقت اب اسلامی نظام سے ورے ورے کسی حالت پر مطمئن نہیں ہو سکتی۔ اب اس کی تاریخی تمنائیں ایک منظم تحریک بن گئی ہیں اور اس تحریک کا راستہ دیر تک روکے رکھنا ایک اقلیت کے بس میں نہیں ہے —— اگرچہ وہ برسرِ اقتدار کیوں نہ ہو!

اب اگر ایک اسلامی نظام کو چلنا ہے تو وہ جب بھی چلے گا مذہبی عنصر اور جدید عنصر کے تعاون ہی سے چلے گا۔ جدید عنصر تمدن کی گاڑی کی ڈرائیونگ کا ماہر ہے مگر وہ اسلام کی شاہراہ کے پیچ و خم سے واقف نہیں ہے۔ دوسری طرف مذہبی عنصر ہے جو اسلام کی شاہراہ سے پوری طرح ماہرانہ واقفیت رکھتا ہے، لیکن اسے تمدن کی گاڑی کا ایک مدت سے تجربہ حاصل نہیں رہا! اب اگر ہم اپنے نظامِ زندگی کی گاڑی کو اسلام کی شاہراہ پر لے جانا چاہیں تو دونوں ہی عناصر کا تعاون اس کام کے لیے ضروری ہے۔ دونوں کو اپنے علم کو یکجا جمع کرنا ہوگا اور دونوں کو ایک متفق علیہ منصوبے پر عملی سرگرمیوں کا دارومدار رکھنا ہوگا۔

لیکن دونوں کے درمیان مطلوبہ تعاون بغیر اس کے رونما نہیں ہو سکتا ہے کہ باہمی بیگانگی اور تعصب اور نفرت و حقارت کے رویے کو ختم کیا جائے۔ اور یہ بغیر اس کے ختم نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف مذہبی عنصر کشادہ دلی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ نظامِ تمدن کو چلانے کی عملی مہارت جدید طبقے ہی کو حاصل ہے، اور دوسری طرف جدید طبقہ عالی ظرفی کے ساتھ اس واقعہ کو تسلیم کرے کہ دین کے اصول و مقاصد اور احکام و قوانین کی ترجمانی کا حق مذہبی عنصر کو اس کے مقابلے میں بہرحال نمایاں طور پر حاصل ہے (باقی ص ۲۱۲ پر)

تفہیم القرآن

الکہف

(۲)

یاد کرو کہ جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا تھا مگر ابلیس نے نہ کیا تھا۔[۱] وہ جنوں میں سے تھا اس لیے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔[۲] اب کیا تم مجھے چھوڑ

---

[۱] اس سلسلۂ کلام میں قصۂ آدم و ابلیس کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود گمراہ انسانوں کو ان کی اس حماقت پر متنبہ کرنا ہے کہ وہ اپنے رحیم و شفیق پروردگار اور خیرخواہ پیغمبروں کو چھوڑ کر اپنے اس ازلی دشمن کے پھندے میں پھنس رہے ہیں جو اول روز آفرینش سے ان کے خلاف حسد رکھتا ہے۔

[۲] یعنی ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا بلکہ جنوں میں سے تھا، اسی لیے اطاعت سے باہر ہو جانا اس کے لیے ممکن ہوا۔ فرشتوں کے متعلق قرآن تصریح کرتا ہے کہ وہ فطرۃً مطیع فرمان ہیں۔ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (التحریم-۱) "اللہ جو حکم بھی ان کو دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے"۔ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ، یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (النحل-۶) "وہ سرکشی نہیں کرتے، اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے"۔ بخلاف اس کے جن انسانوں کی طرح ایک ذی اختیار مخلوق ہے جسے پیدائشی فرمانبردار نہیں بنایا گیا ہے بلکہ کفر و ایمان اور طاعت و معصیت دونوں کی قدرت بخشی گئی ہے۔ اسی حقیقت کو یہاں کھولا گیا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا اس لیے اس نے خود اپنے اختیار سے فسق کی راہ انتخاب کی۔ یہ تصریح ان تمام غلط فہمیوں کو رفع کر دیتی ہے جو عموماً لوگوں میں پائی جاتی ہیں کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا اور فرشتہ بھی کوئی معمولی نہیں بلکہ معلم الملکوت۔

رہا یہ سوال کہ جب ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا تو پھر قرآن کا یہ طرز بیان کیونکر صحیح ہو سکتا ہے (باقی صفحہ پر)

کہ اُس کو اور اس کی ذُرّیت کو اپنا سرپرست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ بڑا ہی بُرا بدل ہے جسے ظالم لوگ اختیار کر رہے ہیں۔

مَیں نے آسمان و زمین پیدا کرتے وقت اُن کو نہیں بلایا تھا اور نہ خود اُن کی اپنی تخلیق میں اُنہیں شریک کیا تھا۔[1] میرا یہ کام نہیں ہے کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بنایا کروں۔

پھر کیا کریں گے یہ لوگ اُس روز جبکہ اِن کا رب اِن سے کہے گا کہ پکارو اب اُن ہستیوں کو جنہیں تم میرا شریک سمجھ بیٹھے تھے۔[2] یہ ان کو پکاریں گے، مگر وہ اِن کی مدد کو نہ آئیں گے اور ہم ان کے

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۳) کہ "ہم نے ملائکہ کو کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا"؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں کو سجدے کا حکم دینے کے معنی یہ تھے کہ وہ تمام مخلوقاتِ ارضی بھی انسان کی مطیعِ فرمان بن جائیں جو کرۂ زمین کی عملداری میں فرشتوں کے زیرِ انتظام آباد ہیں۔ چنانچہ فرشتوں کے ساتھ یہ سب مخلوقات بھی سربسجود ہوئیں۔ مگر ابلیس نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

[1] مطلب یہ ہے کہ یہ شیاطین آخر تمہاری طاعت و بندگی کے مستحق کیسے بن گئے؟ بندگی کا مستحق تو صرف خالق ہی ہو سکتا ہے۔ اور ان شیاطین کا حال یہ ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق میں شریک ہونا تو درکنار، یہ تو خود مخلوق ہیں۔

[2] یہاں پھر وہی مضمون بیان کیا گیا ہے جو اس سے پہلے بھی کئی جگہ قرآن میں گذر چکا ہے کہ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے احکام اور رہنمائی کا اتباع کرنا دراصل اس کو خدائی میں اللہ کا شریک ٹھیرانا ہے، خواہ آدمی اس دوسرے کو زبان سے خدا کا شریک قرار دیتا ہو یا نہ قرار دیتا ہو۔ بلکہ اگر آدمی ان دوسری ہستیوں پر لعنت بھیجتے ہوئے بھی امرِ الٰہی کے مقابلے میں ان کے اوامر کا اتباع کر رہا ہو تب بھی وہ شرک کا مجرم ہے۔ چنانچہ یہاں شیاطین کے معاملے میں آپ علانیہ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں ہر ایک ان پر لعنت کرتا ہے، مگر اس لعنت کے باوجود جو لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں، قرآن اُن سب کو یہ الزام دے رہا ہے کہ تم شیاطین کو خدا کا شریک بنائے ہوئے ہو۔ یہ شرک اعتقادی نہیں بلکہ شرکِ عملی ہے اور قرآن اس کو بھی شرک ہی کہتا ہے۔

درمیان ایک ہی ہلاکت کا گڑھا مشترک کر دیں گے[1]۔ سارے مجرم اُس روز آگ دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اب انہیں اس میں گرنا ہے اور وہ اس سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے۔ ع

ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہُوا ہے۔ اُن کے سامنے جب ہدایت آئی تو اسے ماننے اور اپنے رب کے حضور معافی چاہنے سے آخر ان کو کس چیز نے روک دیا؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ منتظر ہیں اُن کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جو پچھلی قوموں کے ساتھ ہو چکا ہے، یا یہ کہ وہ عذاب کو سامنے آتے دیکھ لیں[2]!

رسولوں کو ہم اس کام کے سوا اور کسی غرض کے لیے نہیں بھیجتے کہ وہ بشارت اور تنبیہ کی خدمت انجام دے دیں[3]۔ مگر کافروں کا حال یہ ہے کہ وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے

---

[1] مفسرین نے اس آیت کے دو مفہوم بیان کیے ہیں۔ ایک وہ جو ہم نے اوپر ترجمے میں اختیار کیا۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ "ہم ان کے درمیان عداوت ڈال دیں گے"۔ یعنی دنیا میں ان کے درمیان جو دوستی تھی آخرت میں وہ سخت عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔

[2] یعنی جہاں تک دلیل و حجت کا تعلق ہے، قرآن نے حق واضح کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ دل و دماغ کو اپیل کرنے کے جتنے مؤثر طریقے اختیار کرنے ممکن تھے، وہ سب بہترین انداز میں یہاں اختیار کیے جا چکے ہیں۔ اب وہ کیا چیز ہے جو انہیں قبول حق میں مانع ہو رہی ہے؟ صرف یہ کہ انہیں عذاب کا انتظار ہے۔ جوتے کھائے بغیر سیدھے نہیں ہونا چاہتے۔

[3] اس آیت کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی یہاں چسپاں ہوتے ہیں:-

ایک یہ کہ رسولوں کو ہم اسی لیے بھیجتے ہیں کہ فیصلے کا وقت آنے سے پہلے لوگوں کو فرمانبرداری کے اچھے اور نافرمانی کے برے انجام سے خبردار کر دیں۔ مگر یہ بے وقوف لوگ ان پیشگی تنبیہات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے اور اُسی انجام بد کو دیکھنے پر مصر ہیں جس سے رسول انہیں بچانا چاہتے ہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو عذاب ہی دیکھنا منظور ہے تو پیغمبر سے اس کا مطالبہ نہ کریں کیونکہ پیغمبر عذاب دینے کے لیے نہیں بلکہ عذاب سے پہلے صرف خبردار کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔

ہیں اور انہوں نے میری آیات کو اور اُن تنبیہات کو جو انہیں کی گئیں مذاق بنا لیا ہے۔ اب اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جسے اس کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جائے اور وہ اُن سے مُنہ پھیرے اور اُس بُرے انجام کو بھول جائے جس کا سر و سامان اس نے اپنے لیے خود اپنے ہاتھوں کیا ہے۔ (جن لوگوں نے یہ روش اختیار کی ہے) ان کے دلوں پر ہم نے غلاف چڑھا دیئے ہیں جو انہیں قرآن کی بات نہیں سمجھنے دیتے، اور اُن کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کر دی ہے۔ تم انہیں ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ وہ اس حالت میں کبھی ہدایت نہ پائیں گے۔ ۱؎

تیرا رب بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ وہ ان کے کرتوتوں پر انہیں پکڑنا چاہتا تو جلدی ہی عذاب بھیج دیتا۔ مگر ان کے لیے وعدے کا ایک وقت مقرر ہے اور اس سے بچ کر بھاگ نکلنے کی یہ کوئی راہ نہ پائیں گے۔ ۲؎

یہ عذاب رسیدہ بستیاں تمہارے سامنے موجود ہیں ۳؎، انہوں نے جب ظلم کیا تو ہم

۱؎ یعنی جب کوئی شخص یا گروہ دلیل و حجت اور خیر خواہانہ نصیحت کے مقابلے میں جھگڑالوپن پر اتر آتا ہے اور حق کا مقابلہ جھوٹ اور مکر و فریب کے ہتھیاروں سے کرنے لگتا ہے، اور اپنے کرتوتوں کا برا انجام دیکھنے سے پہلے کسی کے سمجھانے سے اپنی غلطی ماننے پر تیار نہیں ہوتا، تو اللہ تعالیٰ پھر اس کے دل پر قفل چڑھا دیتا ہے اور اس کے کان ہر صدائے حق کے لیے بہرے کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ نصیحت سے نہیں مانا کرتے بلکہ ہلاکت کے گڑھے میں گر کر ہی انہیں یقین آتا ہے کہ وہ ہلاکت تھی جس کی راہ پر وہ بڑھے چلے جا رہے تھے۔

۲؎ یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جس وقت کسی سے قصور سرزد ہو اُسی وقت پکڑ کر اسے سزا دے ڈالے۔ یہ اس کی شانِ رحیمی کا تقاضا ہے کہ مجرموں کے پکڑنے میں وہ جلد بازی سے کام نہیں لیتا اور مدتوں ان کو سنبھلنے کا موقع دیتا رہتا ہے۔ مگر سخت نادان ہیں وہ لوگ جو اس ڈھیل کو غلط معنی میں لیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ خواہ کچھ ہی کرتے رہیں، ان سے کبھی باز پرس ہونی ہی نہیں۔

۳؎ اشارہ ہے سبا اور ثمود اور مدین اور قوم لوط کے اجڑے دیاروں کی طرف جنہیں قریش کے لوگ اپنے تجارتی سفروں میں آتے جاتے دیکھا کرتے تھے اور جن سے عرب کے دوسرے لوگ بھی خوب واقف تھے۔

نے انہیں ہلاک کر دیا، اور ان میں سے ہر ایک کی ہلاکت کے لیے ہم نے وقت مقرر کر رکھا تھا ؏
ذرا ان کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰ کو پیش آیا تھا) جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں، ورنہ میں ایک زمانۂ دراز تک چلتا ہی رہوں گا؎۔ پس جب وہ ان کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر اس طرح دریا

؎ اس مرحلے پر یہ قصہ سنانے سے مقصود کفار اور مومنین، دونوں کو ایک اہم حقیقت پر متنبہ کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظاہر بیں نگاہ دنیا میں بظاہر جو کچھ ہوتے دیکھتی ہے اس سے بالکل غلط نتائج اخذ کر لیتی ہے کیونکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ مصلحتیں نہیں ہوتیں جنہیں ملحوظ رکھ کر وہ کام کرتا ہے۔ ظالموں کا پھلنا پھولنا اور بے گناہوں کا تکلیفوں میں مبتلا ہونا، نافرمانوں پر انعامات کی بارش اور فرمانبرداروں پر مصائب کا ہجوم، بدکاروں کا عیش اور نیکوکاروں کی خستہ حالی، یہ وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور محض اس لیے کہ لوگ ان کی کنہ کو نہیں سمجھتے، ان سے عام طور پر ذہنوں میں اُلجھنیں، بلکہ غلط فہمیاں تک پیدا ہو جاتی ہیں۔ کافر اور ظالم ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ دنیا اندھیر نگری ہے، کوئی اس کا راجہ نہیں، اور ہے تو چوپٹ ہے۔ یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مومن اس طرح کے واقعات کو دیکھ کر دل شکستہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات سخت آزمائشوں کے مواقع پر ان کے ایمان تک متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کارخانۂ مشیت کا پردہ اٹھا کر ذرا اس کی ایک جھلک دکھائی تھی تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہاں شب و روز جو کچھ ہو رہا ہے کیسے اور کن مصلحتوں سے ہو رہا ہے اور کس طرح واقعات کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ کو یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟ اس کی کوئی تصریح قرآن نے نہیں کی ہے۔ حدیث میں عوفی کی ایک روایت ہمیں ضرور ملتی ہے جس میں وہ ابنِ عباس کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا تھا جب فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ نے مصر میں اپنی قوم کو آباد کیا تھا۔ لیکن ابن عباس سے جو قوی تر روایات بخاری اور دوسری کتب حدیث میں منقول ہیں وہ اس بیان کی تائید نہیں کرتیں، اور نہ کسی دوسرے ذریعے سے ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ کبھی مصر میں رہے تھے۔ بلکہ قرآن اس کی تصریح کرتا ہے (باقی صفحہ ۱۵۸ پر)

میں چلی گئی جیسے کہ کوئی سُرنگ لگی ہو۔ آگے جاکر موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا " لاؤ ہمارا ناشتہ، آج

(بقیہ حاشیہ ۵۸) کرتا ہے کہ مصر سے خروج کے بعد ان کا سارا زمانہ سینا اور تیہ میں گزرا۔ اس لیے یہ روایت تو قابل قبول نہیں ہے۔ البتہ جب ہم خود اس قصے کی تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مشاہدات حضرت موسیٰ کو ان کی نبوت کے ابتدائی دور میں کرائے گئے ہوں گے، کیونکہ آغاز نبوت ہی میں انبیاء علیہم السلام کو اس طرح کی تعلیم و تربیت درکار ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت موسیٰ کو ان مشاہدات کی ضرورت اُس زمانے میں پیش آئی ہوگی جبکہ بنی اسرائیل کو بھی اُسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آرہا تھا جن سے مسلمان مکہ معظمہ میں دوچار تھے۔ ان دو وجوہ سے ہمارا قیاس یہ ہے (واللہ اعلم عند اللہ) کہ اس واقعہ کا تعلق اُس دور سے ہے جبکہ مصر میں بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا اور سردارانِ قریش کی طرح فرعون اور اس کے درباری بھی عذاب میں تاخیر دیکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ اوپر کوئی نہیں ہے جو اس سے باز پرس کرنے والا ہو، اور مکے کے مظلوم مسلمانوں کی طرح مصر کے مظلوم مسلمان بھی بے چین ہو ہو کر پوچھ رہے تھے کہ خدایا ان ظالموں پر انعامات کی اور ہم پر مصائب کی یہ بارش کب تک؟ حتیٰ کہ خود حضرت موسیٰ یہ پکار اٹھے تھے کہ رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ (یونس۔ ۹۰) " اے پروردگار، تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں بڑی شان و شوکت اور مال و دولت دے رکھی ہے، اے پروردگار، کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ دنیا کو تیرے راستے سے بھٹکا دیں"؟

اگر ہمارا یہ قیاس درست ہو تو پھر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ غالباً حضرت موسیٰ کا یہ سفر سوڈان کی جانب تھا اور مجمع البحرین سے مراد وہ مقام ہے جہاں موجودہ شہر خرطوم کے قریب دریائے نیل کی دو بڑی شاخیں البحر الابیض اور البحر الازرق آکر ملتی ہیں۔

بائیبل اس واقعے کے باب میں بالکل خاموش ہے۔ البتہ تلمود میں اس کا ذکر موجود ہے، مگر وہ اسے حضرت موسیٰ کے بجائے ربّی یوحانان بن لاوی کی طرف منسوب کرتی ہے اور اس کا بیان یہ ہے کہ ربّی مذکور کو یہ واقعہ حضرت الیاس کے ساتھ پیش آیا تھا جو دنیا سے زندہ اٹھائے جانے کے بعد فرشتوں میں شامل کر لیے گئے ہیں اور دنیا کے انتظام پر مامور ہیں۔ ممکن ہے کہ خروج سے پہلے کے بہت سے واقعات کی طرح یہ واقعہ بھی ربانی (حاشیہ ۵۹ >

کے سفر میں تو ہم بری طرح تھک گئے ہیں"۔ خادم نے کہا "آپ نے دیکھا نہیں کہ جب ہم اُس چٹان کے پاس ٹھیرے ہوئے تھے اُس وقت کیا ماجرا پیش آیا؟ مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر (آپ سے کرنا) بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی"۔ موسیٰ نے کہا "یہی تو ہم چاہتے تھے"[لے]۔ چنانچہ وہ دونوں اپنے نقشِ قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا[ٹلے]۔

موسیٰ نے اس سے کہا "کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اُس دانش کی

(بقیہ حاشیہ ۵۸) بنی اسرائیل کے ہاں اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رہا ہو اور صدیوں بعد انہوں نے قصے کی کڑیاں کہیں سے کہیں لے جا کر جوڑ دی ہوں۔ تلمود کی اسی روایت سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ قرآن میں اس مقام پر موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں بلکہ کوئی اور موسیٰ ہیں۔ لیکن نہ تو تلمود کی ہر روایت لازماً صحیح تاریخ قرار دی جاسکتی ہے، نہ ہمارے لیے یہ گمان کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ قرآن میں کسی ایسے مجہول الحال موسیٰ کا ذکر اس طریقے سے کیا گیا ہوگا، اور پھر جبکہ معتبر احادیث میں حضرت اُبی بن کعب کی یہ روایت موجود ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قصے کی تشریح فرماتے ہوئے موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ پیغمبر بنی اسرائیل کو بتایا ہے تو کسی مسلمان کے لیے تلمود کا بیان لائقِ التفات نہیں رہتا۔

لے یعنی منزلِ مقصود کا یہی نشان تو ہم کو بتایا گیا تھا۔ اِس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ حضرت موسیٰ کا یہ سفر اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اور ان کو منزلِ مقصود کی علامت یہی بتائی گئی تھی کہ جہاں ان کے ناشتے کی مچھلی غائب ہو جائے وہی مقام اُس بندے کی ملاقات کا ہے جس سے ملنے کے لیے وہ بھیجے گئے تھے۔

ٹلے اس بندے کا نام تمام معتبر احادیث میں خضر بتایا گیا ہے۔ اس لیے اُن لوگوں کے اقوال کسی التفات کے مستحق نہیں ہیں جو اسرائیلی روایات سے متاثر ہو کر حضرت الیاس کی طرف اس قصے کو منسوب کرتے ہیں۔ اُن کا یہ قول نہ صرف اس بنا پر غلط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے متصادم ہوتا ہے، بلکہ اس بنا پر بھی سراسر لغو ہے کہ حضرت الیاس حضرت موسیٰ کے کئی سو برس بعد پیدا ہوئے ہیں۔

تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے؟" اس نے جواب دیا" آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے، اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو آخر آپ اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں۔" موسیٰ نے کہا" انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔" اس نے کہا" اچھا، اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں جب تک کہ میں خود اس کا آپ سے ذکر نہ کروں۔" ع

اب وہ دونوں روانہ ہوئے، یہاں تک کہ جب وہ ایک کشتی میں سوار ہو گئے تو اس شخص نے کشتی میں شگاف ڈال دیا۔ موسیٰ نے کہا" آپ نے اس میں شگاف ڈال دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں؟ یہ تو آپ نے ایک سخت حرکت کر ڈالی۔" اس نے کہا" میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟" موسیٰ نے کہا" بھول چوک پر مجھے نہ پکڑیے۔ میرے معاملے میں آپ ذرا سختی سے کام نہ لیں۔"

پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ ان کو ایک لڑکا ملا اور اس شخص نے اسے قتل کر دیا۔ موسیٰ نے کہا" آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی حالانکہ اس نے کسی کا خون نہ کیا تھا؟ یہ کام تو آپ نے بہت ہی بُرا کیا۔" اس نے کہا" میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟" موسیٰ نے کہا" اس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں۔ لیجیے، اب تو میری طرف سے آپ کو عذر مل گیا۔"

پھر وہ آگے چلے یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا مانگا، مگر انہوں نے اِن دونوں کی ضیافت سے انکار کر دیا۔ وہاں انہوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی۔ اُس شخص نے اس دیوار کو پھر قائم کر دیا۔ موسیٰ نے کہا" اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت لے سکتے تھے۔" اُس نے کہا" بس، میرا تمہارا ساتھ ختم ہوا۔ اب میں تمہیں اُن باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ اُس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں، کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ رہا وہ لڑکا، تو اس کے والدین مومن تھے،

ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کفر سے ان کو تنگ کریگا، اس لیے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلۂ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو۔ اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اِس دیوار کے نیچے اِن بچوں کے لیے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اس لیے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے، میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا ہے۔ یہ ہے حقیقت اُن باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے۔[۱] ع ع

[۱] اس قصے میں ایک بڑی پیچیدگی ہے جسے رفع کرنا ضروری ہے۔ حضرت خضر نے یہ تین کام جو کیے ہیں ان میں سے تیسرا کام تو خیر شریعت سے نہیں ٹکراتا، مگر پہلے دونوں کام یقیناً اُن احکام سے متصادم ہوتے ہیں جو ابتدائے عہدِ انسانیت سے آج تک تمام شرائعِ الٰہیہ میں ثابت رہے ہیں۔ کوئی شریعت بھی کسی انسان کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کی مملوکہ چیز کو خراب کر دے، اور کسی متنفس کو بے قصور قتل کر ڈالے حتیٰ کہ اگر کسی انسان کو بطریقِ الہام بھی یہ معلوم ہو جائے کہ ایک کشتی کو آگے جا کر ایک غاصب چھین لے گا، اور فلاں لڑکا بڑا ہو کر سرکش اور کافر نکلے گا، تب بھی اس کے لیے خدا کی بھیجی ہوئی شریعتوں میں سے کسی شریعت کی رُو سے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اس الہامی علم کی بنا پر کشتی میں چھید کر دے اور ایک بےگناہ لڑکے کو مار ڈالے۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ حضرت خضر نے یہ دونوں کام اللہ کے حکم سے کیے تھے، فی الواقع اس پیچیدگی کو کچھ بھی رفع نہیں کرتا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ حضرت خضر نے یہ کام کس کے حکم سے کیے تھے۔ ان کا حکمِ الٰہی سے ہونا تو بالیقین ثابت ہے کیونکہ حضرت خضر خود فرماتے ہیں کہ ان کے یہ افعال ان کے اختیاری نہیں ہیں بلکہ اللہ کی رحمت انکی محرک ہوئی ہے، اور اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ خود فرما چکا ہے کہ حضرت خضر کو اللہ کی طرف سے ایک علمِ خاص حاصل تھا۔ پس یہ امر تو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ یہ کام اللہ کے حکم سے کیے گئے تھے مگر اصل سوال جو یہاں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے اِن احکام کی نوعیت کیا تھی؟ ظاہر ہے کہ یہ تشریعی احکام نہ تھے، کیونکہ شرائعِ الٰہیہ کے جو بنیادی اصول قرآن اور اس سے پہلے کی کتب آسمانی (باقی ص ۱۶۳ پر)

اور اے محمدؐ، یہ لوگ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں[1]۔ ان سے کہو میں اس

(بقیہ حاشیہ ۶۱ سے) سے ثابت ہیں ان میں کبھی کسی انسان کے لیے یہ گنجائش نہیں رکھی گئی کہ وہ بلا ثبوت جرم کسی دوسرے انسان کو قتل کر دے۔ اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ احکام اپنی نوعیت میں اللہ تعالیٰ کے اُن تکوینی احکام سے مشابہت رکھتے ہیں جن کے تحت دنیا میں ہر آن کوئی بیمار ڈالا جاتا ہے اور کوئی تندرست کیا جاتا ہے، کسی کو موت دی جاتی ہے اور کسی کو زندگی سے نوازا جاتا ہے، کسی کو تباہ کیا جاتا ہے اور کسی پر نعمتیں نازل کی جاتی ہیں۔ اب اگر یہ تکوینی احکام ہیں تو ان کے مخاطب صرف فرشتے ہی ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں شرعی جواز و عدم جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اپنے ذاتی اختیار کے بغیر صرف اوامرِ الٰہیہ کی تعمیل کرتے ہیں۔ رہا انسان، تو خواہ وہ بلا ارادہ کسی تکوینی حکم کے نفاذ کا ذریعہ بنے، اور خواہ الہاماً اس طرح کا کوئی غیبی علم اور حکم پا کر اس پر عملدرآمد کرے، بہرحال وہ گناہ گار ہونے سے نہیں بچ سکتا اگر وہ کام جو اس نے کیا ہے کسی حکم شرعی سے ٹکراتا ہو۔ اس لیے کہ انسان بحیثیت اس کے کہ وہ انسان ہے، احکام شرعیہ کا مکلف ہے اور اصول شریعت میں کہیں یہ گنجائش نہیں پائی جاتی کہ کسی انسان کے لیے محض اس بنا پر احکام شرعیہ میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی جائز ہو کہ اسے بذریعۂ الہام اس خلاف ورزی کا حکم ملا ہے اور بذریعۂ علمِ غیب اس خلاف ورزی کی مصلحت بتائی گئی ہے۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس پر نہ صرف تمام علمائے شریعت متفق ہیں، بلکہ اکابر صوفیہ بھی بالاتفاق یہی بات کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ آلوسی نے تفصیل کے ساتھ عبدالوہاب شَعرانی، محی الدین ابن عربی، مجدد الف ثانی، شیخ عبدالقادر جیلانی، جُنید بغدادی، سری سقطی، ابوالحسین النوری، ابوسعید الخراز، ابوالعباس احمد الدینوری اور امام غزالی جیسے نامور بزرگوں کے اقوال نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اہل تصوف کے نزدیک بھی کسی ایسے الہام پر عمل کرنا خود صاحب الہام تک کے لیے جائز نہیں ہے جو نص شرعی کے خلاف ہو۔ (روح المعانی۔ ج ۱۶۔ ص ۱۶-۱۸)

اب کیا ہم یہ مان لیں کہ اس قاعدۂ کلیہ سے صرف ایک انسان مستثنیٰ کیا گیا ہے اور وہ ہیں حضرت خضرؑ؟ یا یہ سمجھیں کہ خضر کوئی انسان نہ تھے بلکہ اللہ کے اُن بندوں میں سے تھے جو مشیت الٰہی کے تحت (نہ کہ شریعت الٰہی کے تحت) کام کرتے ہیں؟

پہلی صورت کو ہم تسلیم کر لیتے اگر قرآن بالفاظ صریح یہ کہہ دیتا کہ وہ "بندہ" جس کے پاس حضرت موسیٰ (باقی صفحہ ۱۹۳ پر)

[1] یہ حاشیہ ۱۲۳ پر دیکھیں

کا کچھ حال تم کو سناتا ہوں [1]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲) اس تربیت کیلیے بھیجے گئے تھے، انسان تھا۔ لیکن قرآن اس کے انسان ہونے کی تصریح نہیں کرتا بلکہ صرف عَبْدٌ مِّنْ عِبَادِنَا (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ) کے الفاظ بولتا ہے جو ظاہر ہے کہ اس بندے کے انسان ہونے کو مستلزم نہیں ہیں۔ پھر کسی صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کوئی ایسا ارشاد منقول نہیں ہے جس میں صراحت کے ساتھ حضرت خضر کو نوعِ انسانی کا ایک فرد قرار دیا گیا ہو۔ اس باب میں مستند ترین روایات وہ ہیں جو عن سعید بن جبیر، عن ابن عباس، عن ابی بن کعب، عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے ائمہ حدیث کو پہنچی ہیں۔ ان میں حضرت خضر کے لیے صرف رَجُل کا لفظ آیا ہے، جو اگرچہ مرد انسانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر انسان کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ چنانچہ خود قرآن میں یہ لفظ جنوں کے لیے مستعمل ہو چکا ہے جیسا کہ سورۂ جن میں ارشاد ہوا ہے وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ۔ نیز یہ ظاہر ہے کہ جن یا فرشتہ یا کوئی اور غیر مرئی وجود جب انسانوں کے سامنے آئے گا تو انسانی شکل ہی میں آئے گا، اور اس حالت میں اس کو بشر یا انسان ہی کہا جائے گا۔ حضرت مریم کے سامنے جب فرشتہ آیا تھا تو قرآن اس واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے کہ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "وہاں انہوں نے ایک مرد کو پایا" حضرت خضر کے انسان ہونے پر صریح دلالت نہیں کرتا۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس پیچیدگی کو رفع کرنے کی صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم "خضر" کو انسان نہ مانیں بلکہ فرشتوں میں سے، یا اللہ کی کسی اور ایسی مخلوق میں سے سمجھیں جو شرائع کی مکلف نہیں ہے بلکہ کارگاہِ مشیت کی کارکن ہے۔ متقدمین میں سے بھی بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے جسے ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ماوردی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

[1] (حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۶۳) وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ کا عطف لامحالہ پچھلے قصے ہی پر ہے۔ اس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ قصۂ موسیٰ و خضر بھی لوگوں کے سوال ہی کے جواب میں سنایا گیا ہے اور یہ بات ہمارے اس قیاس کی تائید کرتی ہے کہ اس سورے کے یہ تینوں اہم قصے دراصل کفار مکہ نے اہلِ کتاب کے مشورے سے امتحاناً دریافت کیے تھے۔

[2] یہ مسئلہ قدیم زمانے سے اب تک مختلف فیہ رہا ہے کہ یہ "ذوالقرنین" جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، کون تھا۔

(باقی صفحہ ۱۹۲ پر)

ہم نے اس کو زمین میں اقتدار عطا کر رکھا تھا اور اسے ہر قسم کے اسباب و وسائل

(بقیہ حاشیہ ۶۳) قدیم زمانے میں بالعموم مفسرین کا میلان سکندر کی طرف تھا، لیکن قرآن میں اس کی جو صفات و خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ مشکل ہی سے اس پر چسپاں ہوتی ہیں۔ جدید زمانے میں تاریخی معلومات کی بنا پر مفسرین کا میلان زیادہ تر ایران کے فرماں روا خورس (خسرو یا سائرس) کی طرف ہے، اور یہ نسبتہً زیادہ قرین قیاس ہے، مگر بہرحال ابھی تک یقین کے ساتھ کسی شخصیت کو اس کا مصداق نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔

قرآن مجید جس طرح اس کا ذکر کرتا ہے اس سے ہم کو چار باتیں وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہیں:-

(۱) اس کا لقب ذوالقرنین (لغوی معنی "دو سینگوں والا") کم از کم یہودیوں میں، جن کے اشارے سے کفار مکہ نے اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا، ضرور معروف ہونا چاہیے۔ اس لیے لامحالہ ہمیں یہ معلوم کرنے کے لیے اسرائیلی لٹریچر کی طرف رجوع کرنا پڑیگا کہ وہ "دو سینگوں والے" کی حیثیت سے کس شخصیت یا سلطنت کو جانتے تھے۔

(۲) وہ ضرور کوئی بڑا فرمانروا اور فاتح ہونا چاہیے جس کی فتوحات مشرق سے مغرب تک پہنچی ہوں، اور تیسری جانب، شمال یا جنوب میں بھی وسیع ہوئی ہوں۔ ایسی شخصیتیں نزول قرآن سے پہلے چند ہی گزری ہیں اور لامحالہ انہی میں سے کسی میں اس کی دوسری خصوصیات ہمیں تلاش کرنی ہونگی۔

(۳) اس کا مصداق ضرور کوئی ایسا فرمانروا ہونا چاہیے جس نے اپنی مملکت کو یاجوج وماجوج کے حملوں سے بچانے کے لیے کسی پہاڑی درے پر ایک مستحکم دیوار بنائی ہو۔ اس علامت کی تحقیق کے لیے ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ یاجوج و ماجوج سے مراد کونسی قومیں ہیں، اور پھر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان کے علاقے سے متصل کونسی ایسی دیوار کبھی دنیا میں بنائی گئی ہے اور وہ کس نے بنائی ہے۔

(۴) اس میں مذکورہ بالا خصوصیات کے ساتھ ایک یہ خصوصیت بھی پائی جانی چاہیے کہ وہ خدا پرست اور عادل فرمانروا ہو، کیونکہ قرآن یہاں سب سے بڑھ کر اس کی اسی خصوصیت کو نمایاں کرتا ہے۔

ان میں سے پہلی علامت آسانی کے ساتھ خورس پر چسپاں کی جا سکتی ہے، کیونکہ بائیبل کے صحیفہ دانی ایل میں دانیال نبی کا جو خواب بیان کیا گیا ہے اس میں وہ یونانیوں کے عروج سے قبل میڈیا اور فارس کی ربانی مشترکہ

بخشے تھے۔ اُس نے (پہلے مغرب کی طرف ایک مہم کا سروسامان کیا) حتیٰ کہ جب وہ غروبِ آفتاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۹) متحدہ سلطنت کو ایک مینڈھے کی شکل میں دیکھتے ہیں جس کے دو سینگ تھے۔ یہودیوں میں اس "دو سینگوں والے" کا بڑا چرچا تھا کیونکہ اسی کی ٹکر نے آخر کار بابل کی سلطنت کو پاش پاش کیا اور بنی اسرائیل کو اسیری سے نجات دلائی۔

دوسری علامت بڑی حد تک اُس پر چسپاں ہوتی ہے، مگر پوری طرح نہیں۔ اس کی فتوحات بلاشبہ مغرب میں ایشیائے کوچک اور شام کے سواحل تک اور مشرق میں باختر (بلخ) تک وسیع ہوئیں، مگر شمال یا جنوب میں اس کی کسی بڑی مہم کا سراغ ابھی تک تاریخ سے نہیں ملا ہے، حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ ایک تیسری مہم کا بھی ذکر کرتا ہے۔

تیسری علامت کے بارے میں یہ تو قریب قریب متحقق ہے کہ یاجوج و ماجوج سے مراد روس کے وہ قبائل ہیں جو تاتاری، منگولی، ہُن اور سیتھین وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں اور قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر حملے کرتے رہے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ اُن کے حملوں سے بچنے کے لیے قفقاز کے جنوبی علاقے میں دربند اور داریال کے استحکامات تعمیر کیے گئے تھے۔ لیکن یہ ابھی تک ثابت نہیں ہو سکا ہے کہ خورس ہی نے یہ استحکامات تعمیر کیے تھے۔

آخری علامت قدیم زمانے کے معروف فاتحوں میں اگر کسی پر چسپاں کی جا سکتی ہے تو وہ خورس ہی ہے کیونکہ اس کے دشمنوں تک نے اس کے عدل کی تعریف کی ہے اور بائیبل کی کتاب عزرا اس بات پر شاہد ہے کہ وہ ضرور ایک خدا پرست اور خدا ترس بادشاہ تھا جس نے بنی اسرائیل کو ان کی خدا پرستی ہی کی بنا پر بابل کی اسیری سے رہا کیا اور اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لیے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا حکم دیا۔

اس بنا پر ہم یہ تو ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ نزولِ قرآن سے پہلے جتنے مشہور فاتحینِ عالم گزرے ہیں ان میں سے خورس ہی کے اندر "ذوالقرنین" کی علامات زیادہ پائی جاتی ہیں، لیکن تعین کے ساتھ اسی کو ذوالقرنین قرار دے دینے کے لیے ابھی مزید شہادتوں کی ضرورت ہے۔ تاہم دوسرا کوئی فاتح قرآن کی بتائی ہوئی علامات کا اتنا بھی مصداق نہیں ہے جتنا خورس ہے۔

کی حد تک پہنچ گیا[ل] تو اس نے سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا[ل] اور وہاں اُسے ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا "اے ذوالقرنین، تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے[ل]"۔ اس نے کہا، "جو ان میں سے ظلم کریگا ہم اس کو سزا دینگے، پھر وہ اپنے رب کی طرف پلٹایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دیگا۔ اور جو ان میں سے ایمان لائے گا اور نیک عمل کریگا اُس کے لیے اچھی جزا ہے اور ہم اس کو نرم احکام دیں گے"۔

پھر اُس نے (ایک دوسری مہم کی) تیاری کی یہاں تک کہ طلوع آفتاب کی حد تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے لیے دُھوپ سے بچنے کا کوئی

ل غروب آفتاب کی حد سے مراد، جیسا کہ ابن کثیر نے لکھا ہے اقصی ما یسلك فیه من الارض من ناحیة المغرب ہے، نہ کہ آفتاب غروب ہونے کی جگہ۔ مراد یہ ہے کہ وہ مغرب کی جانب ملک پر ملک فتح کرتا ہوا خشکی کے آخری سرے تک پہنچ گیا جس کے آگے سمندر تھا۔

ل یعنی وہاں غروب آفتاب کے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سورج سمندر کے سیاہی مائل گدلے پانی میں ڈوب رہا ہے۔ اگر فی الواقع ذوالقرنین سے مراد خورس ہی ہو تو یہ ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل ہوگا جہاں بحر ایجین چھوٹی چھوٹی خلیجوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس قیاس کی تائید یہ بات بھی کرتی ہے کہ قرآن یہاں بحر کے بجائے عین کا لفظ استعمال کرتا ہے جو سمندر کے بجائے جھیل یا خلیج ہی پر زیادہ صحت کے ساتھ بولا جا سکتا ہے

ل ضروری نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات براہ راست وحی یا الہام کے ذریعہ ہی سے ذوالقرنین کو خطاب کر کے فرمائی ہو، حتی کہ اس سے ذوالقرنین کا نبی یا محدّث ہونا لازم آئے۔ بلکہ یہ ارشاد زبان حال کے واسطے سے بھی ہو سکتا ہے، اور یہی قرین قیاس ہے۔ ذوالقرنین اُس وقت فتح یاب ہو کر اس علاقے پر قابض ہوا تھا۔ مفتوح قوم اس کے بس میں تھی۔ اللہ نے اس صورت حال میں اُس کے ضمیر کے سامنے یہ سوال رکھ دیا کہ یہ تیرے امتحان کا وقت ہے۔ یہ قوم تیرے آگے بے بس ہے۔ تو ظلم کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اور شرافت کا سلوک کرنا چاہے تو یہ بھی تیرے اختیار میں ہے۔

سامان ہم نے نہیں کیا ہے۔[5] یہ حال تھا اُن کا، اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا اُسے ہم جانتے تھے۔
پھر اس نے ایک اور مہم کا، سامان کیا یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا[6] تو اسے
ان کے پاس ایک قوم ملی جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتی تھی۔[7] ان لوگوں نے کہا کہ "اے ذوالقرنین،
یاجوج اور ماجوج[8] اس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ تو کیا ہم تجھے کوئی ٹیکس اس کام کے لیے دیں
کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند تعمیر کردے؟" اس نے کہا "جو کچھ میرے رب نے مجھے
دے رکھا ہے وہ بہت ہے۔ تم بس محنت سے میری مدد کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان
بند بنائے دیتا ہوں۔[9] مجھے لوہے کی چادریں لاکر دو۔"

---

[5] یعنی وہ ممالک فتح کرتا ہوا مشرق کی جانب ایسے علاقے تک پہنچ گیا جہاں مہذب دنیا کی سرحد ختم ہو گئی تھی اور آگے ایسی وحشی قوموں کا علاقہ تھا جو عمارتیں بنانا تو درکنار خیمے بنانا تک نہ جانتی تھیں۔

[6] چونکہ آگے یہ ذکر آرہا ہے کہ ان دونوں پہاڑوں کے اُس طرف یاجوج ماجوج کا علاقہ تھا، اس لیے لامحالہ ان پہاڑوں سے مراد کاکیشیا کے وہ پہاڑی سلسلے ہی ہو سکتے ہیں جو بحرِ خزر (کیسپین) اور بحرِ اسود کے درمیان واقع ہیں۔

[7] یعنی اس کی زبان ذوالقرنین اور اس کے ساتھیوں کے لیے قریب قریب بالکل اجنبی تھی۔

[8] یاجوج ماجوج سے مراد، جیسا کہ اوپر ایک حاشیے میں اشارہ کیا جا چکا ہے، ایشیا کے شمالی مشرقی علاقے کی وہ قومیں ہیں جو قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر غارت گرانہ حملے کرتی رہی ہیں اور جن کے سیلاب وقتاً فوقتاً اٹھ کر ایشیا اور یورپ، دونوں طرف رخ کرتے رہے ہیں۔ بائیبل کی کتاب پیدائش (باب ۱۰) میں ان کو حضرت نوح کے بیٹے یافث کی نسل میں شمار کیا گیا ہے، اور یہی بیان مسلمان مورخین کا بھی ہے۔ حزقی ایل کے صحیفے (باب ۳۸ و ۳۹) میں ان کا علاقہ روس اور توبل (موجودہ توبالسک) اور مسک (موجودہ ماسکو) بتایا گیا ہے۔ اسرائیلی مورخ یوسیفوس اُن سے مراد سیتھین قوم لیتا ہے جس کا علاقہ بحرِ اسود کے شمال اور مشرق میں واقع تھا۔ جیروم کے بیان کے مطابق ماجوج کاکیشیا کے شمال میں بحرِ خزر کے قریب آباد تھے۔

[9] یعنی فرمانروا ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ اپنی رعایا کو غارت گروں کے حملے سے بچاؤں۔ اس کام کے لیے تم پر کوئی الگ ٹیکس لگانا میرے لیے جائز نہیں ہے۔ ملک کا جو خزانہ اللہ تعالیٰ نے میرے حوالے کیا ہے وہ اس خدمت کے لیے کافی ہے۔ البتہ ہاتھ پاؤں کی محنت سے تم کو میری مدد کرنی ہو گی۔

آخر جب دونوں پہاڑوں کے درمیانی خلا کو اس نے پاٹ دیا تو لوگوں سے کہا کہ اب آگ دہکاؤ حتیٰ کہ جب (یہ آہنی دیوار) بالکل آگ کی طرح سرخ ہو گئی تو اس نے کہا "لاؤ، اب میں اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیلونگا" (یہ بند ایسا تھا کہ) یاجوج ماجوج اس پر چڑھ کر بھی نہ آسکتے تھے اور اس میں نقب لگانا ان کے لیے اور بھی مشکل تھا۔ ذوالقرنین نے کہا "یہ میرے رب کی رحمت ہے۔ مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئیگا تو وہ اس کو پیوندِ خاک کر دیگا[۱]، اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے[۲]۔"

اور اس روز[۳] ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے کہ (سمندر کی موجوں کی طرح) ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں اور صور پھونکا جائیگا اور ہم سب انسانوں کو ایک ساتھ جمع کرینگے۔ اور وہ دن ہوگا کہ جہنم کافروں کے سامنے لے آئی جائیگی، ان کافروں کے سامنے جو میری نصیحت کی طرف سے اندھے بنے ہوئے تھے اور کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے ع

تو کیا[۴] یہ لوگ، جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے، یہ خیال رکھتے ہیں کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز

---

۱ یعنی اگرچہ میں نے اپنی حد تک انتہائی مستحکم دیوار تعمیر کی ہے، مگر یہ لازوال نہیں ہے۔ جب تک اللہ کی مرضی ہے یہ قائم رہیگی، اور جب وہ وقت آئیگا جو اللہ نے اس کی تباہی کے لیے مقدر کر رکھا ہے تو پھر اس کو پارہ پارہ ہونے سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی۔ "وعدے کا وقت" ذو معنی لفظ ہے۔ اس سے مراد اس دیوار کی تباہی کا وقت بھی ہے اور وہ ساعت بھی جو اللہ نے ہر چیز کی موت اور فنا کے لیے مقرر فرما دی ہے، یعنی قیامت!

۲ یہاں پہنچکر ذوالقرنین کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصہ اگرچہ کفارِ مکہ کے امتحانی سوال پر سنایا گیا ہے، مگر قصۂ اصحاب کہف اور قصۂ موسیٰ و خضر کی طرح اس کو بھی قرآن نے اپنے قاعدے کے مطابق اپنے مدعا کے لیے پوری طرح استعمال کیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ذوالقرنین، جس کی عظمت کا حال تم نے اہل کتاب سے سنا ہے، محض ایک فاتح ہی نہ تھا، بلکہ توحید اور آخرت کا قائل تھا، عدل و انصاف اور فیاضی کے اصولوں پر عامل تھا، اور تم لوگوں کی طرح کم ظرف نہ تھا کہ ذرا سی سرداری ملی اور سمجھ بیٹھے کہ ہم چو من دیگرے نیست۔

۳ یعنی قیامت کے روز۔ ذوالقرنین نے جو اشارہ قیامت کے وعدۂ برحق کی طرف کیا تھا اُسی کی مناسبت سے یہ فقرے اُس کے قول پر اضافہ کرتے ہوئے ارشاد فرمائے جا رہے ہیں۔

۴ یہ پوری سورت کا خاتمۂ کلام ہے۔ اس لیے اس کی مناسبت ذوالقرنین کے قصے میں نہیں ربانی قصہ

بنالیں؟ ہم نے ایسے کافروں کی ضیافت کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے۔

اے محمدؐ، ان سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے اُن کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۸) بلکہ سورۃ کے مجموعی مضمون میں تلاش کرنی چاہیے۔ سورۃ کا مجموعی مضمون یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو شرک چھوڑ کر توحید اختیار کرنے اور دنیا پرستی چھوڑ کر آخرت پر یقین لانے کی دعوت دے رہے تھے۔ مگر قوم کے بڑے بڑے سردار اپنی دولت اور شوکت و حشمت کے زعم میں نہ صرف آپ کی اس دعوت کو رد کر رہے تھے، بلکہ اُن چند راستی پسند انسانوں کو بھی، جنہوں نے یہ دعوت قبول کر لی تھی، ظلم و ستم اور تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اس پر وہ ساری تقریر کی گئی جو شروع سورہ سے یہاں تک چلی آ رہی ہے۔ اور اسی تقریر کے دوران میں یکے بعد دیگرے ان تین قصوں کو بھی، جنہیں مخالفین نے امتحاناً دریافت کیا تھا، ٹھیک مواقع پر نگینوں کی طرح جڑ دیا گیا۔ اب تقریر ختم کرتے ہوئے پھر کلام کا رُخ اسی مدعا کی طرف پھیرا جا رہا ہے جسے تقریر کے آغاز میں پیش کیا گیا تھا اور جس پر رکوع ۴ سے ۵ تک مسلسل گفتگو کی جا چکی ہے۔

۱؎ یعنی کیا یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی ان کا خیال یہی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ روش ان کے لیے نافع ہو گی؟

۲؎ اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ "جن کی ساری سعی و جہد دنیا کی زندگی ہی میں گم ہو کر رہ گئی"۔ یعنی انہوں نے جو کچھ بھی کیا خدا سے بے نیاز اور آخرت سے بے فکر ہو کر صرف دنیا کے لیے کیا۔ دنیوی زندگی ہی کو اصل زندگی سمجھا۔ دنیا کی کامیابیوں اور خوشحالیوں ہی کو اپنا مقصود بنایا۔ خدا کی ہستی کے اگر قائل ہوئے بھی تو اس بات کی کبھی فکر نہ کی کہ اس کی رضا کیا ہے اور ہمیں کبھی اس کے حضور جا کر اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے۔ اپنے آپ کو محض ایک خود مختار و غیر ذمہ دار حیوانِ عاقل سمجھتے رہے جس کے لیے دنیا کی اس چراگاہ سے تمتع کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔

دیکھیں گے[1]۔ ان کی جزا جہنم ہے اُس کفر کے بدلے جو انہوں نے کیا اور اُس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے رہے۔ البتہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، ان کی میزبانی کے لیے فردوس کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اُس جگہ سے نکل کر کہیں جانے کو اُن کا جی نہ چاہے گا[2]۔

اَے محمدؐ کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں[3] لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں، بلکہ اگر اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے۔

اَے محمدؐ، کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے ع ۱۲

[1] یعنی اس طرح کے لوگوں نے دنیا میں خواہ کتنے ہی بڑے کارنامے کیے ہوں، بہرحال وہ دنیا کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ اپنے قصر اور محلات، اپنی یونیورسٹیاں اور لائبریریاں، اپنے کارخانے اور معمل، اپنی سڑکیں اور ریلیں، اپنی ایجادیں اور صنعتیں، اپنے علوم و فنون اور اپنی آرٹ گیلریاں، اور دوسری وہ چیزیں جن پر وہ فخر کرتے ہیں، ان میں سے تو کوئی چیز بھی اپنے ساتھ لیے ہوئے وہ خدا کے ہاں نہ پہنچیں گے کہ خدا کی میزان میں اس کو رکھ سکیں۔ وہاں جو چیز باقی رہنے والی ہے وہ صرف مقاصدِ عمل اور نتائجِ عمل ہیں۔ اب اگر کسی کے سارے مقاصد دنیا تک محدود تھے اور نتائج بھی اس کو دنیا ہی میں مطلوب تھے اور دنیا میں وہ اپنے نتائجِ عمل دیکھ بھی چکا ہے تو اس کا سب کیا کرایا دنیائے فانی کے ساتھ ہی فنا ہو گیا۔ آخرت میں جو کچھ پیش کر کے وہ کوئی وزن پا سکتا ہے وہ تو لازماً کوئی ایسا ہی کارنامہ ہونا چاہیے جو اس نے خدا کی رضا کے لیے کیا ہو، اس کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے کیا ہو اور اُن نتائج کو مقصود بنا کر کیا ہو جو آخرت میں نکلنے والے ہیں۔ ایسا کوئی کارنامہ اگر اس کے حساب میں نہیں ہے تو وہ ساری دوڑ دھوپ بلاشبہ اکارت گئی جو اس نے دنیا میں کی تھی۔

[2] یعنی اُس حالت سے بہتر اور کوئی حالت ہو گی ہی نہیں کہ جنت کی زندگی کو اس سے بدل لینے کے لیے ان کے دلوں میں کوئی خواہش پیدا ہو۔

[3] "باتوں" سے مراد اس کے کام اور کمالات اور عجائبِ قدرت و حکمت ہیں۔

اسلامی دستور کی تدوین

[یہ وہ تقریر ہے جو ۲۴ - نومبر ۵۲ء کو بار ایسوسی ایشن کراچی کے صدر جناب محمد محسن صاحب صدیقی کی دعوت پر ایک اجتماع میں کی گئی تھی۔]

حضرات! میں بار ایسوسی ایشن کے محترم صدر اور سیکرٹری کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ستھرے مجمع کے سامنے مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا قیمتی موقعہ دیا۔ یہ ہماری قوم کا کھن ہے اور اس کے کسی ایک فرد کو متفق کر لینا ہزاروں آدمیوں کے متفق کرنے کی نسبت زیادہ قیمتی اور وزنی ہے۔ میں اس نادر موقعہ کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں اور انشاء اللہ اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرونگا۔

میرا ارادہ یہاں کوئی مفصل تقریر کرنے کا تو نہیں ہے، کیونکہ دراصل یہ ایک مجلسِ مذاکرہ ہے جو اسلامی دستور کی بنیادوں پر تبادلۂ خیال کرنے کے لیے منعقد کی گئی ہے، لیکن چونکہ یہ موضوع ایسا ہے کہ اس کے بارے میں اگر ابتداءً بطور مقدمہ چند باتیں بیان نہ کر دی جائیں تو اس امر کا اندیشہ ہے کہ مباحثے کے دوران میں بہت سے ایسے مسائل چھڑ جائیں جن کو واضح کرنے کے لیے پھر ایک تقریر کرنے کی ضرورت پیش آئے، اس لیے میں پہلے چند اصولی باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد جو سوالات کیے جائیں گے ان کے جواب عرض کرونگا۔

مسئلے کی نوعیت | ہمارے سامنے اس وقت جو مسئلہ پیش ہے اس کی نوعیت کو پہلے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس ملک کا دستور اسلامی ہونا چاہیے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اسلامی دستور کہیں لکھا لکھایا موجود ہے اور مطالبہ صرف اسے نافذ کر دینے کا ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ جسے ہم کو حل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ایک غیر تحریری دستور (Unwritten Constitution) کو ایک تحریری دستور (Written Constitution) میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں[1]۔ جس چیز کو ہم اسلامی دستور کہتے

[1] یہاں تحریری دستور کی اصطلاح کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ دراصل اس سے مراد ایک (باقی صفحہ ۱۸۲ پر)

ہیں وہ دراصل ایک غیر تحریری دستور ہے اور اس کے چند ماخذ (Sources) ہیں جن سے استفادہ کرکے ہمیں اپنے ملک کے حالات کے مطابق ایک تحریری دستور مرتب کرنا ہے۔

غیر تحریری دستور دنیا میں کوئی انوکھی اور نرالی چیز نہیں ہے۔ اٹھارویں صدی تک دنیا کی ساری حکومتوں کے نظام غیر تحریری دستوروں پر چلتے رہے ہیں اور آج بھی دنیا کی ایک بہت بڑی سلطنت (سلطنت برطانیہ) بغیر کسی تحریری دستور کے چل رہی ہے۔ اگر کبھی انگلستان کو ضرورت پیش آئے کہ وہ اپنے دستور کو تحریری شکل میں مدون کرے تو لامحالہ اسے اپنے غیر تحریری دستور کے مختلف ماخذ سے مواد اکٹھا کرکے اپنے دستور کی دفعات مرتب کرنی پڑیں گی۔ ایسی ہی کچھ صورت اس وقت ہمیں درپیش ہے۔

اسلامی دستور کے ماخذ اسلام کے غیر تحریری دستور کے ماخذ چار ہیں۔

اس کا سب سے پہلا ماخذ قرآن مجید ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے فرامین موجود ہیں۔ یہ احکام و فرامین انسان کی پوری زندگی کے معاملات پر حاوی ہیں۔ ان میں صرف انفرادی کردار اور سیرت ہی کے بارے میں ہدایات نہیں دی گئی ہیں بلکہ اجتماعی زندگی (Social Life) کے بھی ہر پہلو کی اصلاح و تنظیم کے لیے کچھ اصول اور کچھ قطعی احکام دیئے گئے ہیں، اور اس سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمان اپنی ریاست کن اصولوں پر اور کن مقاصد کے لیے قائم کریں۔

دوسرا ماخذ سنتِ رسول صلعم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی ہدایات کو اور اس کے دیئے ہوئے اصولوں کو عرب کی سرزمین میں کس طرح نافذ کیا، کس طرح اسلام کے تخیل کو عمل کا جامہ پہنایا، کس طرح اس تخیل پر ایک سوسائٹی کی تشکیل کی، پھر کس طرح اس سوسائٹی کو منظم کرکے ایک اسٹیٹ کی شکل دی، اور اس اسٹیٹ کے مختلف شعبوں کو کس طرح چلا کر بتایا۔ یہ چیزیں سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہمیں معلوم ہو سکتی ہیں اور انہی کی مدد سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ قرآن کا ٹھیک

(بقیہ حاشیہ ص۱۷۹) ایسی دستاویز ہے جس میں نظم مملکت کے قواعد درج کیے گئے ہوں اور جسے مملکت میں مستقل قانونی حیثیت حاصل ہو۔ جس مملکت کا دستور اس طرح کی کسی دستاویز کی صورت میں لکھا نہ گیا ہو اس کے دستوری قواعد چاہے مختلف ماخذ میں لکھے ہوئے ہی موجود ہوں بہرحال ان کے مجموعے کو غیر تحریری دستور ہی کہا جائے گا۔

ٹھیک نشانہ کیا ہے۔ یہ قرآن کے دیئے ہوئے اصولوں کا عملی حالات پر انطباق (Application) ہے جس سے ہم کو اسلامی دستور کے لیے نہایت قیمتی نظائر (Precedents) حاصل ہوتے ہیں اور دستوری روایات (Constitutioual Traditions) کا بڑا اہم مواد بہم پہنچتا ہے

تیسرا ماخذ خلافتِ راشدہ کا تعامل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلامی سٹیٹ کو خلفاء راشدین نے جس طرح چلایا اس کے نظائر اور اس کی روایات سے حدیث، تاریخ اور سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور یہ سب چیزیں ہمارے لیے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلام میں یہ اصول شروع سے آج تک مسلم رہا ہے کہ دینی احکام و ہدایات کی جو تعبیریں صحابۂ کرام نے بالاتفاق کی ہیں (جسے اصطلاح میں اجماع کہا جاتا ہے) اور دستوری و قانونی مسائل کے جو فیصلے خلفائے راشدین نے صحابہ کے مشورے سے کر دیئے ہیں وہ ہمارے لیے حجت ہیں، یعنی ان کو جوں کا توں تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ صحابہ کے کسی معاملہ میں متفق ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مستند تعبیرِ قانون اور معتبر طریقِ عمل ہے۔ جہاں ان کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں وہاں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مسئلے میں دو یا دو سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہے اور ایسے معاملات میں دلیل سے ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ مگر جہاں ان کے درمیان کامل اتفاق ہو گیا ہے وہاں ان کا فیصلہ لازماً ایک ہی تعبیر اور ایک ہی طرزِ عمل کو صحیح و مستند ثابت کر دیتا ہے، کیونکہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے براہِ راست شاگرد اور تربیت یافتہ تھے اور ان سب کا متفق ہو کر دین کے معاملے میں غلطی کر جانا یا دین کے سمجھنے میں راہِ صواب سے ہٹ جانا قابلِ تسلیم نہیں ہے۔

چوتھا ماخذ مجتہدین امت کے وہ فیصلے ہیں جو انہوں نے مختلف دستوری مسائل پیش آنے پر اپنے علم و بصیرت کی روشنی میں کیے ہیں۔ یہ چاہے حجت نہ ہوں، مگر بہرحال اسلامی دستور کی روح اور اس کے اصولوں کو سمجھنے میں ہماری بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔

یہ ہیں ہمارے دستور کے چار مآخذ۔ ہم جب کبھی اسلامی حکومت کا دستور تحریری شکل میں لانا چاہیں، ہم کو انہی مآخذ سے اس کے قواعد جمع کر کے مرتب کرنے ہوں گے، بالکل اسی طرح جیسے انگلستان کے لوگ اگر آج اپنا دستور مدوّن کرنا چاہیں تو انہیں اپنے وضعی قانون (Statute Law)

اور عرفی قانون (Common Law) اور اپنے دستوری رواج (Constitutional Usage) وغیرہ سے ایک ایک جزئیہ اخذ کر کے صفحۂ کاغذ پر ثبت کرنا ہو گا اور بہت سے دستوری احکام و قواعد ان کو اپنی عدالتوں کے فیصلوں سے چن چن کر نکالنے ہونگے۔

مشکلات جہاں تک اسلامی دستور کے ان مآخذ کا تعلق ہے، یہ سب تحریری شکل میں موجود ہیں۔ قرآن لکھا ہوا ہے۔ سنت رسول اور تعامل خلفائے راشدین کے متعلق سارا مواد کتابوں میں مل سکتا ہے مجتہدین امت کی آراء بھی معتبر کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نہ مفقود ہے نہ نایاب۔ لیکن اس کے باوجود ان مآخذ سے اس غیر تحریری دستور کے قواعد اخذ کر کے ان کو تحریری دستور کی شکل دینے میں چند مشکلات اور چند دقتیں حائل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے آپ ان کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

اصطلاحات کی اجنبیت سب سے پہلی دقت زبان کی ہے۔ قرآن، حدیث اور فقہ میں دستوری احکام کو بیان کرنے کے لیے جو اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں وہ اب بالعموم لوگوں کے لیے ناقابل فہم ہو گئی ہیں کیونکہ ایک مدت دراز سے ہمارے ہاں اسلام کا سیاسی نظام معطل ہو چکا ہے اور ان اصطلاحوں کا چلن نہیں رہا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کو ہم روزانہ تلاوت کرتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ یہ دستوری اصطلاحات ہیں، مثلاً سلطان، ملک، حکم، امر، ولایت وغیرہ۔ ان الفاظ کے صحیح دستوری مفہوم کو عربی میں بھی کم لوگ سمجھتے ہیں، اور ترجموں میں منتقل ہو کر تو ان کا سارا مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی قرآن کے دستوری احکام کا ذکر سن کر حیرت کے ساتھ پوچھنے لگتے ہیں کہ قرآن میں کونسی آیت دستور سے تعلق رکھتی ہے۔ فی الواقع ان بیچاروں کی حیرت بجا ہے۔ قرآن میں کوئی سورت "الدستور" کے نام سے نہیں ہے اور نہ بیسویں صدی کی اصطلاحات میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے۔

قدیم فقہی لٹریچر کی نامانوس ترتیب دوسری دقت یہ ہے کہ ہمارے فقہی لٹریچر میں دستوری مسائل کہیں الگ ابواب کے تحت یکجا بیان نہیں کیے گئے ہیں بلکہ دستور اور قوانین ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ قانون سے الگ دستور کا جداگانہ تصور بہت بعد کے زمانے کی پیداوار ہے، بلکہ خود لفظ دستور کا استعمال بھی اپنے جدید معنوں میں ابھی حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ البتہ اُن مسائل پر جنہیں

ہم اب دستوری مسائل کہتے ہیں، تمام فقہائے اسلام نے بحث کی ہے مگر ان کی بحثیں ہم کو فقہی کتابوں کے اندر مختلف قانونی ابواب میں بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ ایک مسئلے پر کتاب القضا میں بحث ہے تو دوسرے پر کتاب الامارت میں۔ ایک مسئلہ کتاب السیر (مسائل صلح وجنگ کی کتاب) میں بیان ہوا ہے تو دوسرا کتاب النکاح والطلاق میں۔ ایک مسئلہ کتاب الحدود (فوجداری قانون کی کتاب) میں آیا ہے تو دوسرا کتاب الفئ (پبلک فینانس کی کتاب) میں۔ پھر ان کی زبان اور اصطلاحات آج کل کی رائج اصطلاحوں سے اس قدر مختلف ہیں کہ جب تک کوئی شخص قانون کے مختلف شعبوں اور ان کے مسائل پر کافی بصیرت نہ رکھتا ہو اور پھر عربی زبان سے بھی بخوبی واقف نہ ہو، اس کو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ کہاں قانون ملکی کے درمیان قانون بین الاقوام کا کوئی مسئلہ آگیا ہے اور کہاں پرسنل لا کے درمیان دستوری قانون کے کسی مسئلے پر روشنی ڈال دی گئی ہے۔

پچھلی صدیوں کے دوران میں ہمارے بہترین قانونی دماغوں نے غایت درجہ بیش قیمت ذخیرہ چھوڑا ہے مگر آج ان کی چھوڑی ہوئی میراث کو چھان پھٹک کر ایک ایک قانونی شعبے کے مواد کو الگ الگ کرنا اور اسے منقح صورت میں سامنے لانا ایک بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے جس کے لیے موجودہ نسلیں، جنہوں نے مدتوں سے دوسروں کے پس خوردہ پر قناعت کرلی ہے، مشکل ہی سے آمادہ ہوسکتی ہیں۔ بلکہ ستم یہ ہے کہ آج وہ اپنی اس آبائی میراث کو بے جانے بوجھے حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں۔

نظامِ تعلیم کا نقص تیسری مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم ایک کافی مدت سے بڑی ناقص ہو رہی ہے۔ جو لوگ ہمارے ہاں علومِ دینی پڑھتے ہیں وہ موجودہ زمانے کے علم السیاست اور اس کے مسائل اور دستوری قانون اور اس سے تعلق رکھنے والے معاملات سے بیگانہ ہیں، اس لیے وہ قرآن وحدیث اور فقہ کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے میں تو عمریں گزار دیتے ہیں، مگر ان کے لیے اس وقت کے سیاسی و دستوری مسائل کو آج کل کی زبان اور اصطلاحوں میں سمجھنا اور پھر ان کے بارے میں اسلام کے اصول واحکام کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنا سخت مشکل ہوتا ہے۔ وہ اس بات کے محتاج ہیں کہ ان کے سامنے یہ مسائل اس زبان اور ان اصطلاحوں میں پیش کیے جائیں جنہیں وہ سمجھتے ہیں، پھر وہ آسانی کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ ان کے بارے میں اسلام کے کیا احکام اور اصول ہیں اور وہ کہاں کہاں بیان ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے جدید تعلیم یافتہ

لوگ ہیں جو عملاً ہمارے تمدن و سیاست اور قانون و عدالت کا نظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے جدید مسائل سے تو واقف ہیں، مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کا دین ان مسائل کے بارے میں کیا رہنمائی دیتا ہے۔ وہ دستور اور سیاست اور قانون کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں مغربی تعلیمات اور مغرب کے عملی نمونوں ہی کے ذریعہ سے جانتے ہیں۔ قرآن اور سنت اور اسلامی روایات کے بارے میں ان کی معلومات بہت محدود ہیں۔ اس لیے ان میں سے جو لوگ واقعی نیک نیتی کے ساتھ اسلامی نظام زندگی کا از سر نو احیاء چاہتے ہیں وہ بھی اس کے محتاج ہیں کہ کوئی ان مسائل کے بارے میں اسلام کی ہدایات ان کے سامنے اُس زبان میں پیش کرے جسے وہ سمجھتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی پیچیدگی ہے جو ایک صحیح اسلامی دستور کی تدوین میں حائل ہو رہی ہے۔

اجتہاد بلا علم کا دعویٰ

چوتھی مشکل ایک اور ہے جو اب بڑھتے بڑھتے ایک لطیفے اور مذاق کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ حال میں یہ ایک نرالا انداز فکر پیدا ہوا ہے کہ اسلام میں "پریسٹ ہڈ" نہیں ہے، قرآن اور سنت اور شریعت پر کوئی "ملا" کا اجارہ نہیں ہے کہ بس وہی ان کی تعبیر کرنے کا مجاز ہو، جس طرح وہ تعبیر احکام اور اجتہاد و استنباط کرنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح ہم بھی یہی حق رکھتے ہیں، اور کوئی وجہ نہیں کہ دین کے معاملے میں ملا کی بات ہماری بات سے زیادہ وزنی ہو۔ یہ باتیں وہ لوگ کہتے ہیں جو نہ قرآن و سنت کی زبان سے واقف ہیں، نہ اسلامی روایات پر جن کی نگاہ ہے، نہ اپنی زندگی کے چند روز بھی جنہوں نے اسلام کے تحقیقی مطالعے میں صرف کیے ہیں۔ وہ ایمانداری کے ساتھ اپنے علم کا نقص محسوس کرنے اور اسے دور کرنے کے بجائے سرے سے علم کی ضرورت ہی کا انکار کرنے پر تل گئے ہیں اور اس بات پر مُصر ہیں کہ انہیں علم کے بغیر اپنی تعبیروں سے اسلام کی صورت بگاڑ دینے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ اگر جہالت کی اس طغیانی کو یونہی بڑھنے دیا گیا تو بعید نہیں کہ کل کوئی اٹھ کر کہے کہ اسلام میں "وکیل ہڈ" نہیں ہے اس لیے ہر شخص قانون پر بولے گا چاہے اس نے قانون کا ایک لفظ نہ پڑھا ہو، اور پرسوں کوئی دوسرے صاحب اٹھیں اور فرمائیں کہ اسلام میں "انجینیئر ہڈ" نہیں ہے اس لیے ہم بھی انجینیئرنگ پر کلام کریں گے چاہے ہم اس فن کی الف بے سے بھی واقف نہ ہوں، اور پھر کوئی تیسرے صاحب اسلام میں "ڈاکٹر ہڈ" کا انکار کرکے مریضوں کا علاج کرنے کھڑے ہو جائیں بغیر اس کے کہ ان کو علم طب کی ہوا بھی لگی ہو۔ میں سخت حیران ہوں کہ اچھے

خاصے پڑھے لکھے اور ذی عزت لوگ یہ کیسی اوچھی اور طفلانہ باتیں کرنے پر اتر آئے ہیں اور کیوں انہوں نے اپنی ساری قوم کو ایسا نادان فرض کر لیا ہے کہ وہ ان کی یہ باتیں سُن کر آمنّا وصدّقنا کہہ دیگی۔ بے شک اسلام میں پریسٹ ہڈ نہیں ہے، مگر انہیں معلوم بھی ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام میں نہ تو بنی اسرائیل کی طرح دین کا علم اور دینی خدمات کسی نسل اور قبیلے کی میراث ہیں، اور نہ عیسائیوں کی طرح دین و دنیا کے درمیان تفریق کی گئی ہے کہ دنیا قیصروں کے حوالے اور دین پادریوں کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ بلا شبہ یہاں قرآن اور سنت اور شریعت پر کسی کا اجارہ نہیں ہے اور مُلا کسی نسل یا خاندان کا نام نہیں ہے جس کو دین کی تعبیر کرنے کا آبائی حق ملا ہوا ہو۔ جس طرح ہر شخص قانون پڑھ کر وکیل اور جج بن سکتا ہے، اور ہر شخص انجینیرنگ پڑھ کر انجینیر اور طب پڑھ کر ڈاکٹر بن سکتا ہے اسی طرح ہر شخص قرآن اور سنت کے علم پر وقت اور محنت صرف کرکے مسائل شریعت میں کلام کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے۔ اسلام میں پریسٹ ہڈ نہ ہونے کا اگر کوئی معقول مطلب ہے تو وہ یہی ہے۔ نہ یہ کہ اسلام کو بازیچۂ اطفال بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جس کا جی چاہے اٹھ کر اس کے احکام اور تعلیمات کے بارے میں ماہرانہ فیصلے صادر کرنے شروع کر دے، خواہ اس نے قرآن اور سنت میں بصیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی ہو۔ علم کے بغیر اتھارٹی بننے کا دعویٰ اگر دنیا کے کسی دوسرے معاملے میں قابلِ قبول نہیں ہے تو آخر دین ہی کے معاملے میں کیوں قابلِ قبول ہو؟

یہ چوتھی پیچیدگی ہے جو اسلامی دستور کی تدوین کے معاملے میں اب ڈال دی گئی ہے، اور اس وقت درحقیقت یہی سب سے بڑی پیچیدگی ہے۔ پہلی تین مشکلات کو تو محنت اور کوشش سے رفع کیا جا سکتا تھا اور خدا کے فضل سے ایک حد تک رفع کر بھی دیا گیا ہے لیکن اس نئی الجھن کا علاج سخت مشکل ہے، خصوصاً جبکہ وہ اُن لوگوں کی طرف سے ہو جو بالفعل اقتدار کی کنجیوں پر قابض ہوں۔

<u>دستور کے بنیادی مسائل</u> اب میں دستور کے چند بڑے بڑے اور بنیادی مسائل کو لے کر مختصراً یہ بتاؤنگا کہ اسلام کے اصلی ماخذ میں ان کے متعلق کیا قواعد ہمیں ملتے ہیں۔ اس سے آپ خود یہ اندازہ کر سکیں گے کہ اسلام دستوری مسائل میں کوئی رہنمائی کرتا ہے یا نہیں، اور کرتا ہے تو آیا اس کی نوعیت محض سفارشات کی ہے یا ایسے قطعی احکام کی جنہیں ہم مسلمان ہوتے ہوئے رد نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں طوالت سے بچنے

کے لیے میں دستور کے صرف ۹ بنیادی مسائل پر گفتگو کروں گا:۔

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ حاکمیت کس کی ہے؟ کسی بادشاہ کی؟ یا کسی طبقہ کی؟ یا پوری قوم کی؟ یا خدا کی؟

(۲) دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسٹیٹ کے حدود عمل کیا ہیں؟ کس حد تک وہ اطاعت کا مستحق ہے اور کہاں اس کی اطاعت کا حق ساقط ہو جاتا ہے؟

(۳) تیسرا بنیادی سوال دستور کے بارے میں یہ ہے کہ ریاست کے مختلف اعضاء (Organs) یعنی انتظامیہ (Executive) عدلیہ (Judiciary) اور مقننہ (Legislature) کے الگ الگ حدود عمل کیا ہیں؟ ان میں سے ہر ایک کیا فریضہ ادا کریگا اور کن حدود کے اندر کرے گا؟

(۴) چوتھا اہم سوال یہ ہے کہ اسٹیٹ کا مقصد وجود کیا ہے؟ کس غرض کے لیے اسٹیٹ کام کرے گا اور اس کی پالیسی کے بنیادی اصول کیا ہیں؟

(۵) پانچواں سوال یہ ہے کہ ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے حکومت کی تشکیل کیسے کی جائیگی؟

(۶) چھٹا سوال یہ ہے کہ حکومت کے نظام کو چلانے والوں کی صفات (Qualifications) کیا ہونگی؟ کون لوگ اس کو چلانے کے لیے اہل قرار دیے جائیں گے؟

(۷) ساتواں سوال یہ ہے کہ دستور میں شہریت کی بنیادیں کیا ہونگی؟ کیسے کوئی شخص اس ریاست کا شہری قرار پائے گا اور کیسے نہیں؟

(۸) آٹھواں سوال یہ ہے کہ شہریوں کے بنیادی حقوق کیا ہیں؟ اور پھر

(۹) نواں سوال یہ ہے کہ شہریوں پر اسٹیٹ کے حقوق کیا ہیں۔

ہر دستور کے معاملے میں یہ سوالات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہمیں دیکھنا ہے کہ اسلام ان سوالات کا کیا جواب دیتا ہے

حاکمیت کس کی ہے؟ | سب سے پہلے اس سوال کو لیجیے کہ اسلامی ریاست کا دستور "حاکمیت" کا مقام کس کو دیتا ہے؟ اس کا قطعی اور ناطق جواب قرآن سے ہمیں یہ ملتا ہے کہ حاکمیت ہر معنی میں اللہ تعالیٰ کی ہے،

اس لیے کہ وہی فی الواقع حاکمِ حقیقی ہے اور اُسی کا یہ حق ہے کہ اس کو حاکمِ اعلیٰ مانا جائے۔ اس مسئلے کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھنا چاہے تو میں اسے مشورہ دونگا کہ پہلے وہ "حاکمیت" کے معنی اور تصور کو اچھی طرح ذہن نشین کرے۔

علمِ سیاست کی اصطلاح میں یہ لفظ اقتدارِ اعلیٰ اور اقتدارِ مطلق کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ کسی شخص یا مجموعۂ اشخاص یا ادارے کے صاحبِ حاکمیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حکم قانون ہے۔ اسے افراد ریاست پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں، اور افراد اس کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہیں خواہ بطوع و رغبت یا بکراہت۔ اس کے اختیاراتِ حکمرانی کو اُس کے اپنے ارادے کے سوا کوئی خارجی چیز محدود کرنے والی نہیں ہے۔ افراد کو اس کے مقابلے میں کوئی حق حاصل نہیں۔ جس کے جو کچھ بھی حقوق ہیں اُسی کے دیے ہوئے ہیں اور وہ جس حق کو بھی سلب کرلے وہ آپ سے آپ معدوم ہوجاتا ہے۔ ایک قانونی حق پیدا ہی اس بنا پر ہوتا ہے کہ شارع (Law giver) نے اس کو پیدا کیا، اس لیے جب شارع نے اس کو سلب کرلیا تو سرے سے کوئی حق باقی ہی نہیں رہا کہ اس کا مطالبہ کیا جاسکے۔ قانون صاحبِ حاکمیت کے ارادے سے وجود میں آتا ہے اور افراد کو اطاعت کا پابند کرتا ہے، مگر خود صاحبِ حاکمیت کو پابند کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں قادرِ مطلق ہے۔ اس کے احکام کے بارے میں خیر اور شر، صحیح اور غلط کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جو کچھ وہ کرے وہی خیر ہے، اس کے کسی تابع کو اسے شر قرار دے کر رد کردینے کا حق نہیں ہے۔ جو کچھ وہ کرے وہ صحیح ہے، کوئی تابع اس کو غلط قرار نہیں دے سکتا۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ اسے سبوح و قدوس اور منزہ عن الخطا مانا جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ ایسا ہو یا نہ ہو۔

یہ ہے قانونی حاکمیت کا تصور جسے ایک قانون داں (فقیہ یا Jurist) پیش کرتا ہے اور جس سے کم چیز کا نام "حاکمیت" نہیں ہے۔ مگر یہ حاکمیت اُس وقت تک بالکل ایک مفروضہ رہتی ہے جب تک کہ اس کی پشت پر کوئی واقعی حاکمیت (یا علم سیاست کی اصطلاح میں سیاسی حاکمیت Political Sovereignty) نہ ہو، یعنی عملاً اُس اقتدار کی مالک جو اس قانونی

حاکمیت کو مسلط کرے

اب پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کوئی حاکمیت فی الواقع انسانی دائرے میں موجود بھی ہے؟ اور ہے تو وہ کہاں ہے؟ کس کو اس حاکمیت کا حامل کہا جاسکتا ہے؟ کیا کسی شاہی نظام میں واقعی کوئی بادشاہ ایسی حاکمیت کا حامل ہے یا کبھی پایا گیا ہے یا پایا جاسکتا ہے؟ آپ کسی بڑے سے بڑے مختار مطلق فرمانروا کو لے لیجیے۔ اس کے اقتدار کا آپ تجزیہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کے اختیارات کو بہت سی خارجی چیزیں محدود کر رہی ہیں جو اس کے ارادے کی تابع نہیں ہیں۔ پھر کیا کسی جمہوری نظام میں کسی خاص جگہ انگلی رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ یہاں واقعی حاکمیت موجود ہے؟ جس کو بھی آپ اس کا حامل قرار دیں گے، تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس کے ظاہری اختیارِ مطلق کے پیچھے کچھ اور طاقتیں ہیں جن کے ہاتھ میں اس کی باگیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علم سیاست کے ماہرین جب حاکمیت کا واضح تصور لے کر انسانی سوسائٹی کے دائرے میں اس کا واقعی مصداق تلاش کرتے ہیں تو انہیں سخت پریشانی پیش آتی ہے۔ کوئی قامت ایسا نہیں ملتا جس پر یہ جامہ راست آتا ہو۔ اس لیے کہ انسانیت کے دائرے میں، بلکہ درحقیقت مخلوقات کے دائرے میں اس قامت کی کوئی ہستی سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن بار بار کہتا ہے کہ فی الواقع حاکمیت کا حامل صرف ایک خدا ہے۔ وہی مختارِ مطلق ہے (فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ)، وہی غیر مسئول اور غیر جواب دہ ہے (لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ)۔ وہی تمام اقتدار کا مالک ہے (بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ)۔ وہی ایک ایسی ہستی ہے جس کے اختیارات کو محدود کرنے والی کوئی طاقت نہیں ہے (وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ)۔ اور اسی کی ذات منزہ عن الخطا ہے (الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ)۔

پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حقیقتِ نفس الامری سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر کسی غیر اللہ کو یہ حاکمانہ حیثیت دے بھی دی جائے تو کیا فی الواقع اس کا یہ حق ہے کہ اس کا حکم قانون ہو، اور اس کے مقابلے میں کسی کا کوئی حق نہ ہو اور اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اور اس کے حکم کے بارے میں خیر و شر یا صحیح و غلط کا سوال نہ اٹھایا جاسکے؟ یہ حق خواہ کسی شخص کو دیا جائے، یا کسی ادارے کو، یا باشندوں کی اکثریت کو، بہرحال یہ پوچھا جائے گا کہ اس کو آخر یہ حق کس بنیاد پر حاصل ہوا ہے؟ اور اس بات کی دلیل کیا ہے کہ اسے افراد پر اس طرح حاکم ہونے کا حق حاصل ہے؟ اس سوال کا زیادہ سے زیادہ اگر کوئی جواب دیا جاسکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ

لوگوں کی رضامندی اس حاکمیت کے برحق ہونے کی دلیل ہے؟ مگر کیا آپ یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی رضامندی سے اپنے آپ کو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دے تو اس خریدار کو اس شخص پر جائز حق مالکانہ حاصل ہو جاتا ہے؟ اگر یہ رضامندی اس ملکیت کو برحق نہیں بناتی تو آخر کسی غلط فہمی کی بنا پر محض جمہور کا رضامند ہو جانا کسی حاکمیت کو برحق کیسے بنا سکتا ہے؟ قرآن اس گتھی کو بھی یہ کہہ کر سلجھا دیتا ہے کہ اللہ کی مخلوق پر کسی مخلوق کو بھی حکم چلانے کا حق نہیں ہے، یہ حق صرف اللہ کو حاصل ہے، اور اس بنا پر حاصل ہے کہ وہی اپنی مخلوق کا خالق ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ "خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کے لیے ہے"۔ یہ ایک ایسی معقول بات ہے جسے کم از کم وہ لوگ تو رد نہیں کر سکتے جو خدا کو خالق تسلیم کرتے ہیں۔

پھر تیسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بالفرض حق اور باطل کی بحث کو نظر انداز کر کے حاکمیت کا یہ منصب کسی انسانی اقتدار کو دے بھی دیا جائے تو کیا اس میں انسانیت کی بھلائی ہے؟ انسان، خواہ وہ کوئی ایک شخص ہو، یا کوئی طبقہ یا کسی قوم کا مجموعہ، بہرحال حاکمیت کی اتنی بڑی خوراک ہضم نہیں کر سکتا کہ افراد پر حکم چلانے کے اس کو غیر محدود اختیارات حاصل ہوں اور اس کے مقابلے میں کسی کا کوئی حق نہ ہو اور اس کے فیصلے کو بے خطا مان لیا جائے۔ اس طرح کے اختیارات جب بھی کسی انسانی اقتدار کو حاصل ہوں گے، ظلم ضرور ہوگا۔ معاشرے کے اندر بھی ظلم ہوگا اور معاشرے کے باہر دوسرے ہمسایہ معاشروں پر بھی ہوگا۔ فساد اس بندوبست کی فطرت میں مضمر ہے اور جب کبھی انسانوں نے زندگی کا یہ ہنجار اختیار کیا ہے فساد رونما ہوئے بغیر نہیں رہا ہے۔ اس لیے کہ جس کی فی الواقع حاکمیت نہیں ہے، اور جس کو حاکمیت کا حق بھی حاصل نہیں ہے، اسے اگر مصنوعی طور پر حاکمیت کا مقام حاصل ہو جائے تو وہ اس منصب کے اختیارات کبھی صحیح طریقے سے استعمال نہیں کر سکتا۔ یہی بات ہے جسے قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ "جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی ظالم ہیں"۔

ان وجوہ سے اسلام میں یہ قطعی طور پر طے کر دیا گیا ہے کہ قانونی حاکمیت اسی خدا کی مانی جائے جس کی واقعی حاکمیت ساری کائنات پر قائم ہے اور جسے انسانوں پر بھی حاکمیت کا لاشریک حق حاصل ہے۔

اس بات کو قرآن میں اتنی بار بیان کیا گیا ہے کہ اس کا شمار مشکل ہے اور اتنے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ پُرزور الفاظ کسی بات کو بیان کرنے کے لیے ہو نہیں سکتے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ فرمایا:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔

حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں، اس کا فرمان ہے کہ خود اُس کے سوا تم کسی کی بندگی و اطاعت نہ کرو، یہی صحیح طریقہ ہے

دوسری جگہ فرمایا:-

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ۔

پیروی کرو اس قانون کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

تیسری جگہ خدا کی اس قانونی حاکمیت سے انحراف کرنے کو صریح کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔

اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی قانونی حاکمیت تسلیم کرنے ہی کا نام ایمان و اسلام ہے اور اس سے انکار قطعی کفر ہے۔

دنیا میں اللہ کی اس قانونی حاکمیت کے نمائندے انبیاء علیہم السلام ہیں یعنی جس ذریعے سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شارع (Legal Sovereign) کا ہمارے لیے کیا حکم اور کیا قانون ہے، وہ ذریعہ انبیاء ہیں اور اسی بنا پر اسلام میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اُن کی بے چون و چرا اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ خدا کی طرف سے جو نبی بھی آیا ہے اس نے یہی اعلان کیا ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ "اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو" اور قرآن اس بات کو بطور ایک قطعی اصول کے بیان کرتا ہے کہ

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ — اور جو رسول کی اطاعت کرے اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی

حتیٰ کہ قرآن کسی ایسے شخص کو مسلمان ماننے سے انکار کرتا ہے جو اختلافی امور میں رسول کو آخری فیصلہ دینے والی اتھارٹی تسلیم نہ کرے:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ — پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلاف میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کریں۔

پھر وہ کہتا ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ — اور کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق ہی نہیں ہے کہ اللہ اور رسول جب کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے پھر خود اپنے معاملے میں فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہ جائے، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

اس کے بعد یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ اسلام میں قانونی حاکمیت خالصتہً اور کلیتہً اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ اس اہم ترین دستوری مسئلے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر سیاسی حاکمیت (Political Sovereignty) کس کی ہے؟ اس کا جواب لامحالہ یہی ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اللہ کی ہے، کیونکہ انسانوں میں جو ایجنسی بھی سیاسی طاقت سے اللہ تعالیٰ کی قانون حاکمیت کو نافذ (enforce,) کرنے کے لیے قائم ہو گی اس کو کسی طرح بھی قانون اور سیاست کی اصطلاح میں صاحب حاکمیت (Sovereign) نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جو طاقت قانونی حاکمیت نہ رکھتی ہو، اور جس کے اختیارات کو پہلے ہی ایک بالاتر قانون نے محدود اور پابند کر دیا ہو جسے بدلنے کا اسے اختیار نہ ہو، وہ حاکمیت کی حامل تو نہیں ہو سکتی۔ اب اس کی صحیح پوزیشن

کس لفظ سے ادا کی جائے؟ اس سوال کو قرآن ہی نے حل کر دیا ہے۔ وہ اسے لفظ خلافت سے تعبیر کرتا ہے یعنی وہ بجائے خود حاکم اعلیٰ نہیں ہے بلکہ حاکم اعلیٰ کی نائب ہے۔

اِس نیابت کے لفظ سے آپ کا ذہن ظل اللہ، اور پاپائیت اور Divine Rights of Kings, کی طرف منتقل نہ ہو جائے۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اللہ کی نیابت کا یہ مقام کسی فردِ واحد یا کسی خاندان، یا کسی مخصوص طبقے کا حق نہیں ہے بلکہ تمام اُن لوگوں کا حق ہے جو اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کریں اور رسول کے ذریعے سے پہنچے ہوئے قانونِ الٰہی کو بالاتر قانون مان لیں:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں سے جنہوں نے تم میں سے ایمان قبول کیا اور عمل صالح کیا کہ وہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا۔

یہ چیز اسلامی خلافت کو قیصریت اور پاپائیت اور مغربی تصور والی مذہبی ریاست Theocracy, کے برعکس ایک جمہوریت بنا دیتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اہلِ مغرب جس چیز کو لفظِ جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں اس میں جمہور کو حاکمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے، اور ہم مسلمان جسے جمہوریت کہتے ہیں اس میں جمہور صرف خلافت کے حامل ٹھیرائے جاتے ہیں۔ ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے اُن کی جمہوریت میں بھی عام رائے دہندوں کی رائے سے حکومت بنتی اور بدلتی ہے اور ہماری جمہوریت بھی اسی کی متقاضی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ان کے تصور کے مطابق جمہوری ریاست مطلق العنان اور مختار مطلق ہے اور ہمارے تصور کے مطابق جمہوری خلافت اللہ کے قانون کی پابند۔

ریاست کے حدودِ عمل خلافت کی اس تشریح سے یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ اسلامی دستور میں ریاست کے حدودِ عمل کیا ہیں۔ جب یہ ریاست اللہ کی خلافت ہے اور اللہ کی قانونی حاکمیت تسلیم کرتی ہے تو لامحالہ اس کا دائرۂ اختیار اُن حدود کے اندر ہی محدود رہے گا جو اللہ نے مقرر کی ہیں۔ ریاست جو کچھ کر سکتی ہے ان حدود کے اندر ہی کر سکتی ہے، ان سے تجاوز کرنے کی وہ از روئے دستور مجاز نہیں ہے۔ یہ بات صرف منطقی طور پر ہی خدا کی قانونی حاکمیت کے اصول سے نہیں نکلتی بلکہ قرآن خود اس کو صاف صاف بیان کرتا ہے۔ وہ جگہ جگہ احکام دے کر متنبہ کرتا ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا

"یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، ان کے پاس نہ پھٹکو" تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا "یہ اللہ کی حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو" وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ "اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں" پھر وہ بطور ایک قاعدۂ کلیہ کے یہ حکم دیتا ہے کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور آخرت کے دن پر۔

اس آیت کی رو سے ریاست کی اطاعت لازماً خدا اور رسول کی اطاعت کے تحت ہے نہ کہ اس سے آزاد، اور اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ احکام خدا و رسول کی پابندی سے آزاد ہو کر ریاست کو سرے سے اطاعت کے مطالبے کا حق ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی نکتے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں واضح فرمایا ہے کہ لَا طَاعَةَ لِمَنْ عَصَى اللّٰهَ "کوئی اطاعت اس شخص کے لیے نہیں ہے جو اللہ کی نافرمانی کرے"۔ اور لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ "خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کے لیے اطاعت نہیں ہے"۔ اس اصول کے ساتھ دوسرا اصول جو یہ آیت مقرر کرتی ہے، یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی میں جو اختلاف بھی رونما ہو، خواہ وہ افراد اور افراد کے درمیان ہو، یا گروہوں اور گروہوں کے درمیان، یا رعیت اور ریاست کے درمیان، یا ریاست کے مختلف شعبوں اور اجزاء کے درمیان، بہرحال اس کا فیصلہ کرنے کے لیے رجوع اس بنیادی قانون ہی کی طرف کیا جائے گا جو اللہ اور اس کے رسول نے ہم کو دیا ہے۔ یہ اصول اپنی عین نوعیت ہی کے اعتبار سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ریاست میں لازماً کوئی ادارہ ایسا ہونا چاہیے جو اختلافی معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے مطابق کرے۔

اعضائے ریاست کے حدودِ عمل | یہیں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ ریاست کے مختلف اعضاء (Organs of the State) کے اختیارات اور حدودِ عمل کیا ہیں۔

مجالسِ قانون ساز کے حدود | مقننہ (Legislature) وہی چیز ہے جسے ہمارے ہاں کی قدیم اصطلاح میں "اہل الحل والعقد" کہا جاتا ہے۔ اس کے معاملہ میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ جو ریاست اللہ اور رسول کی قانونی حاکمیت مان کر بنائی گئی ہو، اس کی مقننہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی ہدایات کے خلاف اپنے اجماع سے بھی کوئی قانون سازی کرنے کی مجاز نہیں ہو سکتی۔ ابھی میں آپ کو قرآن کا یہ فیصلہ سنا چکا ہوں کہ "کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ اور رسول جس معاملے کا فیصلہ کر چکے ہوں اس میں ان کو پھر خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے" اور "جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں"۔ ان احکام کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے احکام کے خلاف کوئی قانون سازی کرنا مجلسِ قانون ساز کے حدودِ اختیار سے باہر ہو، اور ہر ایسا قانون، اگر وہ لیجسلیچر پاس بھی کر دے، لازماً حدودِ دستور سے متجاوز (Ultra vires of the Constitution) قرار پائے۔

اس سلسلہ میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر اسلامی ریاست میں مقننہ کا کام ہی کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں مقننہ کے کئی کام ہیں:-

(۱) جن معاملات میں اللہ اور رسول کے واضح اور قطعی احکام موجود ہیں، ان میں اگرچہ مقننہ کوئی ردوبدل نہیں کر سکتی، مگر یہ کام مقننہ ہی کا ہے کہ ان کے نفاذ کے لیے ضروری قواعد وضوابط Rules and Regulations مقرر کرے۔

(۲) جن معاملات میں کتاب و سنت کے احکام ایک سے زیادہ تعبیرات کے محتمل ہوں، ان میں مقننہ ہی یہ طے کرے گی کہ کونسی تعبیر کو قانونی شکل دی جائے۔ اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ مقننہ ایسے اہل علم پر مشتمل ہو جو تعبیرِ احکام کی اہلیت رکھتے ہوں، ورنہ ان کے غلط فیصلے شریعت کو مسخ کر ڈالیں گے۔ لیکن یہ سوال رائے دہندوں کی صلاحیتِ انتخاب سے تعلق رکھتا ہے۔ اصولاً یہ ماننا پڑے گا کہ قانون سازی کی اغراض کے لیے مقننہ ہی مختلف تعبیرات میں سے ایک کو ترجیح دینے کی مجاز ہے اور اسی کی تعبیر قانون بنے گی بشرطیکہ وہ تعبیر کی حد سے گزر کر تحریف کی حد تک نہ پہنچ جائے۔

(۳) جن معاملات میں احکام موجود نہ ہوں ان میں مقننہ کا کام یہ ہے کہ اسلام کے اصولِ عامہ کو پیشِ نظر

رکھ کر نئے قوانین وضع کرے، یا اگر ان کے بارے میں پہلے سے مدوّن کیے ہوئے قوانین کتب فقہ میں موجود ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لے۔

(۴) جن معاملات میں کوئی اصولی رہنمائی بھی نہ ملتی ہو ان میں یہ سمجھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قانون سازی میں آزاد چھوڑ دیا ہے، اس لیے ایسے معاملات میں مقننہ ہر طرح کے مناسب قوانین بنا سکتی ہے، بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم یا اصول سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ اس معاملے میں اصول یہ ہے کہ جو کچھ ممنوع نہیں ہے وہ مباح ہے۔

یہ چاروں قاعدے ہم کو سنت رسول اور تعامل خلفائے راشدین اور مجتہدین امت کی آراء سے معلوم ہوتے ہیں، اور اگر ضرورت ہو تو میں ان میں سے ہر ایک کا ماخذ بتا سکتا ہوں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جو شخص اسلامی ریاست کے بنیادی اصول سمجھ لے اُسے خود عقل عام (Commonsense) بھی یہ بتا سکتی ہے کہ اس طرز کی ریاست میں مقننہ کے یہی حدودِ عمل ہونے چاہئیں۔

انتظامیہ کے حدودِ عمل | اب انتظامیہ کو لیجیے۔ ایک اسلامی ریاست میں انتظامیہ (Executive) کا اصل کام احکام الٰہی کو نافذ کرنا اور ان کے نفاذ کے لیے ملک اور معاشرے میں مناسب حالات پیدا کرنا ہے۔ یہی امتیازی خصوصیت اس کو ایک غیر مسلم ریاست کی انتظامیہ سے ممیز کرتی ہے، ورنہ ایک کافر حکومت اور مسلم حکومت میں کوئی فرق باقی ہی نہیں رہتا۔ انتظامیہ وہی چیز ہے جسے قرآن میں "اولی الامر" اور حدیث میں "اُمراء" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور قرآن و حدیث، دونوں میں ان کے لیے سمع و طاعت (Obedience) کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ احکامِ خدا و رسول کے تابع رہیں، ان سے آزاد ہو کر معصیت اور بدعت اور احداث فی الدین کی راہ پر نہ چل پڑیں۔ قرآن اس باب میں صاف کہتا ہے کہ:

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔

اور کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہو اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہو اور جس کا امر حدود آشنا ہو

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ـ

اور اُن حد سے گزر جانے والوں کے امر کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں، اصلاح نہیں کرتے ۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس معاملے کو یوں بیان فرماتے ہیں :۔

إن امر عليكم عبد مجدع يقودكم بكتاب الله فاسمعوا واطيعوا

اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

السمع والطاعة على المرء المسلم فی ما احب وكره ما لم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة

ایک مردِ مسلمان پر سمع و طاعت لازم ہے خواہ برضا و رغبت خواہ بکراہت، تاوقتیکہ اس کو معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ پھر اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے نہ طاعت۔

لا طاعة فی معصية انما الطاعة فی المعروف ـ

معصیت میں کوئی طاعت نہیں ہے۔ طاعت صرف معروف میں ہے۔

من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رد ـ

جس نے ہمارے اس کام (یعنی اسلامی نظامِ زندگی) میں کوئی ایسی نئی بات نکالی جو اس کے مزاج سے بیگانہ ہو تو وہ مردود ہے

من وقر صاحب بدعة فقد اعان على هدم الاسلام

جس نے کسی صاحب بدعت (یعنی اسلامی زندگی میں غیر اسلامی طریقے رائج کرنے والے) کی توقیر کی اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔

ان توضیحات کے بعد اس معاملے میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہ جاتا کہ اسلام میں انتظامی حکومت اور اس کے نظم و نسق کے لیے کیا حدودِ عمل مقرر کیے گئے ہیں۔

عدلیہ کے حدودِ عمل | رہی عدلیہ (Judiciary)، جو ہماری قدیم اصطلاح "قضاء" کی ہم معنی ہے، تو اس کا دائرۂ عمل بھی خدا کی قانونی حاکمیت کا اصول آپ سے آپ معین کر دیتا ہے۔ اسلام جب کبھی اپنے اصولوں پر ریاست قائم کرتا ہے، اس کے اولین جج خود انبیاء ہوتے ہیں، اور ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ قانونِ الٰہی کے مطابق کریں۔ پھر جو لوگ انبیاء کے بعد اس کرسی پر

بیٹھیں ان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ اپنے فیصلوں کی بنیاد اس قانون پر رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول سے ان کو ملا ہے۔ قرآن مجید میں سورہ مائدہ کے دو رکوع خاص اسی موضوع پر ہیں۔ اُن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اور بنی اسرائیل کے سارے نبی اور پھر ربانی اور احبار اسی کے مطابق یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ پھر ہم نے ان کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا اور ان کو انجیل عطا کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ اہل انجیل کو چاہیے کہ وہ بھی اس ہدایت پر فیصلے کریں جو اللہ نے انجیل میں نازل کی ہے۔ اس تاریخ کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ ہم نے یہ کتاب (قرآن) تمہاری طرف ٹھیک حق کے ساتھ نازل کی ہے

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ۔

پس تم لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کرو اور اس حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے، لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرو

آگے چل کر اللہ تعالیٰ اس تقریر کو اس فقرے پر ختم فرماتا ہے کہ

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ۔

پھر کیا لوگ جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہیں؟ یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

اس تقریر کے دوران میں اللہ تعالیٰ تین مرتبہ فرماتا ہے کہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون پر فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں، وہی ظالم ہیں، وہی فاسق ہیں۔ اس کے بعد شاید یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ایک اسلامی ریاست کی عدالتیں قانون الٰہی کو نافذ کرنے کے لیے بنتی ہیں نہ کہ اس کے خلاف فیصلے کرنے کے لیے۔

مختلف اعضائے ریاست کا باہمی تعلق اس سلسلے میں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اسلام میں ریاست کے ان تینوں اعضاء کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس باب میں احکام تو موجود نہیں ہیں، مگر عہدِ نبوی اور عہدِ خلافت راشدہ کے تعامل (Conventions) میں ہم کو پوری روشنی ملتی ہے۔ اس تعامل سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک صدر ریاست کا تعلق ہے، وہ صدر ہونے کی حیثیت سے ریاست کے ان تینوں

شعبوں کا صدر رہے۔ یہی حیثیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی، اور یہی خلفائے راشدین کو حاصل رہی۔ مگر صدر سے نیچے اتر کر ہم تینوں شعبوں کو اُس دور میں ایک دوسرے سے الگ پاتے ہیں۔ اُس زمانے میں اہل الحل والعقد الگ تھے، جن کے مشورے سے خلافتِ راشدہ کے دور میں انتظامی معاملات بھی چلائے جاتے تھے اور قانونی مسائل کے فیصلے بھی کیے جاتے تھے۔ نظم ونسق کے ذمہ دار امراء الگ تھے جن کا قضاء (عدالت) میں کوئی دخل نہ تھا۔ اور قاضی (جج اور مجسٹریٹ) الگ تھے جن پر انتظامی ذمہ داریوں کا کوئی بار نہ تھا۔

مملکت کے اہم معاملات میں پالیسی بنانے، یا انتظامی اور قانونی مسائل کو حل کرنے کی جب کبھی ضرورت پیش آتی خلفائے راشدین ہمیشہ اہل الحل والعقد کو بلا کر مشورہ کرتے تھے، اور مشورے سے جب کوئی فیصلہ ہو جاتا، تو اہل الحل والعقد کا کام ختم ہو جاتا۔

انتظامی عہدہ دار خلیفہ کے ماتحت تھے، وہی ان کو مقرر کرتا تھا اور اسی کے احکام کے مطابق وہ نظم ونسق چلاتے تھے۔

قاضیوں کا تقرر بھی اگرچہ خلیفہ کرتا تھا، مگر ایک مرتبہ قاضی مقرر ہو جانے کے بعد پھر خلیفہ کو بھی یہ حق نہ تھا کہ ان کے فیصلوں پر اثر انداز ہو۔ بلکہ اپنی ذاتی حیثیت میں، یا انتظام کے صدر ہونے کی حیثیت میں اگر کسی شخص کا ان کے خلاف کوئی دعویٰ ہوتا تھا، تو ان کو بھی قاضیوں کے سامنے ٹھیک اسی طرح جوابدہی کرنی ہوتی تھی جس طرح رعیت کے کسی معمولی فرد کو کرنی ہوتی تھی۔

اُس زمانے میں ہم کو ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی ایک شخص بیک وقت کسی علاقے کا عامل بھی ہو اور قاضی بھی۔ یا کوئی عامل یا گورنر، یا خود صدرِ ریاست کسی قاضی کے عدالتی فیصلوں میں دخل دینے کا مجاز ہو۔ یا کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی دیوانی و فوجداری دعووں کی جوابدہی سے یا عدالتوں کی حاضری سے مستثنیٰ ہو۔

اس نقشے کی تفصیلات میں ہم اپنی موجودہ ضرورتوں کے مطابق ردوبدل کر سکتے ہیں، مگر اس کے اصول جوں کے توں قائم رہنے چاہئیں۔ جس قسم کے جزوی ردوبدل اس میں کیے جا سکتے ہیں وہ اس طرح کے ہیں کہ مثلاً ہم صدرِ ریاست کے انتظامی و عدالتی اختیارات خلفائے راشدین کی بہ نسبت محدود کر سکتے ہیں، کیونکہ اب اُس درجے کے قابلِ اعتماد صدرِ ریاست ہمیں نہیں مل سکتے جیسے خلفاءِ راشدین تھے۔ اس لیے ہم اپنے

صدر کے انتظامی اختیارات پر بھی پابندیاں عائد کر سکتے ہیں تاکہ وہ ڈکٹیٹر نہ بن جائے، اور اس کو مقدمات کی براہِ راست خود سماعت کرنے اور ان کے فیصلے کرنے سے بھی روک سکتے ہیں تاکہ وہ بے انصافی نہ کرنے لگے۔

(اس موقع پر ایک صاحب نے اٹھ کر سوال کیا کہ آپ کی اس رائے کا ماخذ کیا ہے؟ مقرر نے اس کے جواب میں کہا اس قول کے لیے میری دلیل یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ میں انتظامیہ اور عدلیہ کے شعبے بالکل الگ الگ تھے۔ رہا صدرِ ریاست تو اس کی ذات میں ان دونوں اختیارات کو کسی حکم شرعی کی بنا پر جمع نہیں رکھا گیا تھا، بلکہ اس اعتماد پر جمع کیا گیا تھا کہ وہ جج کی حیثیت سے انصاف کی مسند پر بیٹھ کر اپنی انتظامی مصلحتوں کو دخیل نہ ہونے دینگے۔ بلکہ خلفائے راشدین کی ذات پر تو لوگوں کو اس درجہ اعتماد تھا کہ وہ خود یہ چاہتے تھے کہ آخری عدالتِ انصاف وہی ہوں تاکہ اگر کہیں انصاف نہ ملے تو ان کے پاس ضرور مل جائے۔ اس اعتماد کی مستحق اگر کوئی شخصیت ہم نہ پا سکیں تو اسلامی دستور کے کسی قاعدے نے ہمیں اس بات پر مجبور نہیں کر دیا ہے کہ ہم صدر کی ذات میں چیف جسٹس اور انتظامیہ کے رئیسِ اعلیٰ کی حیثیتیں لازماً جمع رکھیں)۔

اسی طرح اس نقشے میں جو تبدیلیاں ہم کر سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ مثلاً ہم اہل الحل والعقد کے انتخاب کے طریقے اور ان کی مجلس کے ضابطے حسبِ ضرورت بنا سکتے ہیں۔ ہم عدالتوں کے مختلف درجے مخصوص اختیارات حدودِ سماعت اور حدودِ عمل کے ساتھ مقرر کر سکتے ہیں۔ وغیر ذالک۔

یہاں دو سوالات اور پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دینے کی ضرورت ہے۔ اول یہ کہ آیا اسلام میں اس امر کی گنجائش ہے کہ قضاء (عدلیہ) اہل الحل والعقد کے طے کیے ہوئے کسی قانونی مسئلے کو خلافِ کتاب و سنت ہونے کی بنا پر رد کر دے؟ اس باب میں کوئی حکم میرے علم میں نہیں ہے۔ خلافتِ راشدہ کا تعامل بے شک یہی تھا کہ قضاء کو یہ اختیارات حاصل نہیں تھے۔ کم از کم اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی قاضی نے ایسا کیا ہو۔ مگر اس کی وجہ میرے نزدیک یہ تھی کہ اُس وقت اہل الحل والعقد کتاب و سنت میں گہری بصیرت رکھنے والے لوگ تھے، اور سب سے بڑھ کر خود خلفائے راشدین اس معاملے میں قابلِ اعتماد تھے کہ ان کی صدارت میں کوئی مسئلہ خلافِ کتاب و سنت طے نہ ہو سکتا تھا۔ آج اگر ہم اپنے دستور میں اس امر کا کوئی قابلِ اطمینان

انتظام کرسکیں کہ کسی مجلس قانون ساز سے کوئی قانون خلافِ کتاب وسنت پاس نہ ہو سکے، تو عدلیہ کو مقننہ کے فیصلوں کا پابند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا کوئی قابلِ اطمینان انتظام نہ کیا جا سکے تو پھر آخری چارۂ کار یہی ہے کہ عدلیہ کو خلافِ کتاب وسنت قوانین کے رد کرنے کا اختیار دیا جائے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں مقننہ (اہل الحلّ والعقد) کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ محض صدرِ ریاست کی مشیر ہے جس کے مشوروں کو رد یا قبول کرنے کا صدرِ ریاست کو اختیار ہے؟ یا صدرِ ریاست اس کی اکثریت یا اُس کے اجماع کے فیصلوں کا پابند ہے؟ اس باب میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہمی مشورے سے انجام پانے چاہئیں (وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ)، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت صدرِ ریاست کے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ — اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو، پھر (مشورے کے بعد) جب تم عزم کر لو تو اللہ کے بھروسے پر عمل کرو۔

یہ دونوں آیتیں مشورے کو لازم کرتی ہیں، اور صدرِ ریاست کو ہدایت کرتی ہیں کہ جب وہ مشورے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو اللہ کے بھروسے پر اسے نافذ کرے۔ لیکن یہ اُس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیتیں جو ہمارے سامنے پیش ہے۔ حدیث میں بھی اس کے متعلق کوئی قطعی حکم مجھے نہیں ملا ہے۔ البتہ خلافتِ راشدہ کے تعامل سے علمائے اسلام نے بالعموم یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نظمِ ریاست کا اصل ذمہ دار صدرِ ریاست ہے اور وہ اہل الحلّ والعقد سے مشورہ کرنے کا پابند ضرور ہے مگر اس بات کا پابند نہیں ہے کہ ان کی اکثریت یا ان کی متفقہ رائے پر ہی عمل کرے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو "ویٹو" کے اختیارات حاصل ہیں۔

لیکن یہ رائے اِس مجمل صورت میں بڑی غلط فہمیوں کی موجب ہوتی ہے، کیونکہ اسے لوگ موجودہ ماحول میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ماحول اُن کے سامنے نہیں ہوتا جس کے تعامل سے یہ رائے اخذ کی گئی ہے۔ خلافتِ راشدہ کے ماحول میں جن لوگوں کو اہل الحلّ والعقد قرار دیا گیا تھا وہ جدا جدا پارٹیوں کی شکل میں منظم نہ تھے۔ وہ اُن پارلیمنٹری ضابطوں سے بھی کسے ہوئے نہ تھے جن سے موجودہ

زمانے کی مجالس قانون ساز کسی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ مجلس شوریٰ میں پہلے سے الگ الگ اپنی کچھ پالیسیاں وضع کرکے، پروگرام بناکر، اور پارٹی میٹنگس میں فیصلے کرکے بھی نہیں آتے تھے۔ انہیں جب مشورے کے لیے بلایا جاتا تو وہ کھلے دل کے ساتھ آکر بیٹھتے، خلیفہ خود ان کی مجلس میں موجود ہوتا، مسئلہ پیش کیا جاتا، مخالف اور موافق ہر پہلو پر آزادانہ بحث ہوتی، پھر دونوں طرف کے دلائل کا موازنہ کرکے خلیفہ اپنے دلائل کے ساتھ اپنی رائے بیان کرتا۔ یہ رائے بالعموم ایسی ہوتی تھی کہ پوری مجلس اسے تسلیم کرلیتی تھی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ چند لوگ اس سے متفق نہ ہوتے تھے، مگر اسے بالکل غلط اور ناقابلِ تسلیم نہیں بلکہ صرف مرجوح سمجھتے تھے اور فیصلہ ہوجانے کے بعد کم از کم عمل کے لیے اُسی کو مان لیتے تھے۔ پوری خلافتِ راشدہ کی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اہل الحل والعقد کی مجلس میں ایسی تفریق رونما ہوئی ہو کہ رائے شماری کی نوبت آئے۔ اور پوری خلافتِ راشدہ کی تاریخ میں صرف دو مثالیں اس امر کی ملتی ہیں کہ خلیفۂ وقت نے اہل الحل والعقد کی قریب قریب متفقہ رائے کے خلاف کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک جیشِ اُسامہ کا معاملہ۔ دوسرے مرتدین کے خلاف جہاد کا معاملہ۔ لیکن ان دونوں معاملات میں صحابہ نے جس بنا پر خلیفہ کے فیصلے کو مانا وہ یہ نہیں تھی کہ دستورِ اسلامی نے خلیفہ کو ویٹو کے اختیارات دے رکھے ہیں اور دستوری طور پر وہ بادلِ ناخواستہ اس کا فیصلہ ماننے کے لیے مجبور ہیں، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ صحابۂ کرام کو حضرت ابوبکرؓ کے فہم و فراست اور دینی بصیرت پر پورا اعتماد تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ابوبکرؓ اس رائے کی صحت پر اتنا یقین رکھتے ہیں اور دینی مصالح کے لیے اس کو اتنی زیادہ اہمیت دے رہے ہیں، تو انہوں نے کھلے دل سے ان کی رائے کے مقابلے میں اپنی رائے واپس لے لی۔ بلکہ بعد میں ان کی اصابتِ رائے کو کھلم کھلا سراہا اور اعتراف کیا کہ اگر ان مواقع پر ابوبکرؓ استقامت نہ دکھاتے تو اسلام ہی کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ مرتدین کے معاملے میں حضرت عمرؓ نے، جو سب سے بڑھ کر حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اختلاف کرچکے تھے، علی الاعلان کہا کہ اللہ نے ابوبکرؓ کا سینہ اس کام کے لیے کھول دیا اور مجھے معلوم ہوگیا کہ حق وہی ہے جس کا فیصلہ انہوں نے کیا ہے۔

اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اسلام میں ویٹو کا یہ تصور دراصل کس ماحول کی نظیروں سے پیدا ہوا ہے۔ اگر شوریٰ کا طرز اور اس کی روح اور اہلِ شوریٰ کی ذہنیت اور سیرت وہی ہو جو خلافتِ راشدہ

کے اس نمونے میں ہم دیکھتے ہیں تو پھر اس سے بہتر کوئی طریق کار نہیں ہے جو وہاں اختیار کیا گیا۔ اس طریق کار کو اگر ہم اس کے آخری منطقی نتائج تک لے جائیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرز کی مجلس شوریٰ میں اگر صدر ریاست اور ارکان مجلس اپنی اپنی رائے پر اڑ جائیں اور ان میں سے کوئی دوسرے کے مقابلے میں اپنی رائے واپس نہ لے تو استصواب عام (Referendum) کرالیا جائے پھر جس کی رائے کو بھی رائے عام رد کردے وہ مستعفی ہو جائے۔ لیکن جب تک ہمارے لیے اپنے ملک میں اس روح اور اس ذہنیت اور اس طرز کی مجلس شوریٰ بنانا ممکن نہیں ہے، اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم انتظامیہ کو مقننہ کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند کردیں۔

ریاست کا مقصد وجود | اب اس مسئلے کو لیجیے کہ اسلام وہ کونسے بنیادی مقاصد (**Objectives**) پیش کرتا ہے جن کے لیے ایک اسلامی ریاست کو کام کرنا چاہیے۔ قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ان مقاصد کی جو توضیح کی گئی ہے وہ یہ ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

ہم نے اپنے رسول روشن دلائل کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ

(یہ مسلمان جن کو جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَیَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَالَا یَزَعُ بِالْقُرْاٰنِ۔

اللہ حکومت کے ذریعہ سے اُن چیزوں کا سد باب کرتا ہے جن کا سد باب قرآن کے ذریعہ سے نہیں کرتا۔

یعنی جو برائیاں قرآن کی نصیحت اور فہمائش سے نہ دور ہوں ان کو مٹانے اور دبانے کے لیے حکومت کی طاقت درکار ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک اسلامی ریاست کے قیام کا اصل مقصد اُس اصلاحی پروگرام کو ملک کے تمام ذرائع سے عمل میں لانا ہے جو اسلام نے انسانیت کی بہتری کے لیے پیش کیا ہے۔ محض امن کا قیام، محض قومی سرحدوں کی حفاظت، محض عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنا اس کا آخری اور انتہائی مقصد نہیں ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیت جو اسے غیر مسلم ریاستوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ وہ اُن بھلائیوں کو فروغ دینے کی کوشش کرے جن سے اسلام انسانیت کو آراستہ کرنا چاہتا ہے۔ اور ان برائیوں کو مٹانے اور دبانے میں اپنی ساری طاقت خرچ کردے جن سے اسلام انسانیت کو پاک کرنا چاہتا ہے۔ (باقی)

سُنّتِ رسُول

(شیخ مصطفیٰ السباعی)

(۲)

عہد نبوی کے بعد حدیث کے بارے میں صحابہ کا موقف

حضرت زید ابن ثابتؓ سے ابوداؤد اور ترمذی کی یہ روایت پہلے نقل کی جا چکی ہے کہ "اللہ اس آدمی کو خوش اور آسودہ رکھے جس نے میری بات سنی اسے محفوظ کر لیا اور پھر اسے جیسے سنا تھا ویسے ہی دوسروں تک پہنچا دیا۔ بسا اوقات سننے والے سے بڑھکر حافظ وہ شخص ہوتا ہے جس تک سننے والا پہنچاتا ہے"۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا "دیکھو! تم میں سے جو یہاں موجود ہے وہ اُس تک میری بات پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں"۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو وصیت فرمائی کہ وہ صحت و تحقیق کے ساتھ اپنی آئندہ نسلوں تک پہنچائیں اور فرمایا "ایک آدمی کے گنہ گار ہونے کے لیے بس یہی کافی ہے کہ جو سنے، بلا تحقیق اُسے دوسروں تک پہنچا دے"۔

ان ارشادات کے پیشِ نظر صحابہ کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ سنت کی اس امانت کو بلا کم و کاست دوسروں کے حوالے کرنے کا پورا پورا اہتمام کریں، خصوصاً جبکہ وہ دور دراز علاقوں میں پھیل گئے تھے اور تابعین نے طرح طرح کی صعوبتیں جھیل کر اور طویل مسافتیں طے کر کے اُن کے پاس آنا شروع کر دیا تھا۔ حدیث کے پھیلانے اور اسے جمہور مسلمین تک پہنچانے میں مذکورۂ بالا ارشادات نبوی نے ایک زبردست محرک کا کام کیا۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ روایت کی کثرت و قلت کے اعتبار سے صحابہ آپس میں متفاوت تھے۔

مثلاً حضرت زبیر، زید ابن ارقم اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہم سے بہت کم احادیث منقول ہیں۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن زبیر نے اپنے والد سے عرض کیا کہ "آپ فلاں فلاں صحابی کی طرح زیادہ احادیث کیوں بیان نہیں کرتے؟" انہوں نے جواب دیا کہ میں بھی آپؐ کے ہر وقت ساتھ رہا لیکن میں نے آپؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ "جس نے مجھ پہ جھوٹ باندھا وہ آگ میں اپنا مقام بنا لے"۔

اسی طرح ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ زید ابن ارقم سے جب کہا جاتا تھا کہ کوئی حدیث بیان کیجیے تو وہ کہتے "ہم بوڑھے ہو گئے ہیں، ہمارا حافظہ کمزور ہو گیا ہے اور رسول اللہ سے حدیث بیان کرنا ایک بڑا کٹھن کام ہے" سائب بن یزید کہتے ہیں: میں نے سعد بن مالک کے ساتھ مدینے سے مکے تک کا سفر کیا۔ اس اثنا میں میں نے اُن سے ایک حدیث بھی نہیں سنی" حضرت انس بن مالک حدیث بیان کرنے کے بعد کہا کرتے تھے "او کما قال" (آپ نے یہ بات یا تقریباً اس جیسی بات ارشاد فرمائی تھی)۔ حضرت انس کی یہ احتیاط اس بنا پر تھی کہ کہیں کوئی غلط چیز آپ کی طرف نہ منسوب ہو جائے حضرت زبیر، زید بن ارقم اور اُن کی طرح کے دوسرے قلیل الروایت صحابہ نے یہ سب کچھ اس لیے کیا ہے کہ مبادا بلا ارادہ یا غیر شعوری طور پر وہ غلط بیانی کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں۔ نیز انہیں اپنے حافظے پر بھی اس حد تک اعتماد نہیں تھا کہ انہیں اس امر کا کلی اطمینان ہوتا کہ وہ احادیث کے الفاظ اور انداز بیان کو پوری صحت کے ساتھ نقل کر سکیں گے۔ اس لیے اُن کے نزدیک احتیاط کا پہلو اسی میں تھا کہ وہ کم روایت کریں اور صرف وہی حدیث روایت کریں جس کی صحت پر انہیں کامل اعتماد ہو۔

ان سب احتیاطوں پر مستزاد حضرت عمر کی یہ خواہش تھی کہ حدیث میں لوگ ایسے منہمک نہ ہو جائیں کہ قرآن سے غفلت برتنے لگیں۔ قرآن کے نزول پر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا اور اُس کی حفاظت اور نقل و اشاعت کی ضرورت مقدم ترین تھی۔ امام شعبی قرظہؓ بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ قرظہؓ نے کہا "ہم عراق کو جا رہے تھے۔ حضرت عمر ہمارے ساتھ مقام صرار تک آئے۔ یہاں انہوں نے وضو کیا اور کہا: کیا جانتے ہو میں تمہارے ساتھ کیوں آیا ہوں؟ ہم نے کہا: ہاں، اس لیے کہ ہم اصحاب رسول ہیں" حضرت عمر نے فرمایا "تم ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جو قرآن سے خصوصی لگاؤ رکھنے میں مشہور ہیں۔ اس لیے تم لوگ انہیں حدیث سنا سنا کر قرآن سے ان کی دلچسپی کو نہ کم کر دینا۔ قرآن کی تجوید میں کوشش کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم روایت کرنا۔ میں تمہارا شریک ہوں" جب حضرت قرظہ عراق میں پہنچے تو لوگوں نے کہا "ہم سے حدیثِ رسول بیان کیجیے" انہوں نے جواب دیا "مجھے عمرؓ نے روک دیا ہے"

لیکن صحابہ کرام میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے آنحضرتؐ سے کثرت کے ساتھ روایت کیا ہے مثلاً حضرت ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ اُن کی روایت کردہ احادیث سے صحابہ کی محفلیں گرم رہتی

تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص اپنی نوٹ بک "الصادقہ" سے اکثر حدیثیں سنایا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کبارِ صحابہ سے احادیث حاصل کرنے میں گوناگوں تکلیفیں اٹھاتے تھے اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر فرمانِ رسول اللہ سنا کرتے تھے۔ ابن عبدالبر ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے ایک مرتبہ فرمایا "مجھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کے بارے میں اطلاع ملتی تھی تو میرے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا تھا کہ میں کسی آدمی کو بھیج کر انہیں اپنے ہاں بلوا لیتا اور پھر اُن سے حدیث رسولؐ سن لیتا۔ لیکن میں خود جا کر اُن کے دروازے پر انتظار میں لیٹ جایا کرتا تھا، حتیٰ کہ صحابی گھر سے باہر نکلتے اور حدیث بیان کرتے۔" غرضیکہ حضرت ابنِ عباس نے حصولِ حدیث کی خاطر بے حد و حساب مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کیں اور جتنے صحابہؓ سے بھی آپ کی ملاقات ممکن تھی اُن سے مل کر اُن سے احادیث کو تمام و کمال اخذ کیا۔ پھر اس پورے ذخیرے کی نشر و اشاعت کا فریضہ بھی اپنے ذمے لیا اور اس کی ادائیگی میں کسی طرح کا وقار یا غیر ضروری انکسار کا احساس حائل نہ ہو سکا۔ البتہ بعد میں جب جھوٹی احادیث وضع ہونی شروع ہوئیں تو ابن عباسؓ نے روایتِ حدیث میں کمی کر دی۔ امام مسلم اپنی صحیح کے مقدمے میں روایت کرتے ہیں کہ بشیر ابن کعب ابن عباس کے پاس آئے اور حدیثیں بیان کرنا شروع کیں۔ ابن عباسؓ نے کہا "فلاں حدیث ایک بار پھر سنائیے۔" بشیر ابن کعب نے وہ حدیث دوبارہ سنائی اور ساتھ ہی کہا "معلوم نہیں کہ آپ نے میری ساری حدیثیں مان لی ہیں یا صرف اس ایک کو صحیح تسلیم کیا ہے"؟ ابن عباسؓ نے جواب دیا "جب تک کہ وضعِ حدیث کا فتنہ نمودار نہیں ہوا تھا ہم رسول اللہ سے روایت کرتے تھے، لیکن جب سے لوگوں نے غیر ذمہ دارانہ روش اختیار کی ہے ہم نے بھی روایت کرنا ترک کر دیا ہے۔"

کثیر الروایت صحابہ بھی حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے عہد میں کم روایت کرتے تھے کیونکہ یہ دونوں خلفاء ایک طرف حدیث میں تحقیق و تنقید پر بہت زور دیتے تھے اور دوسری طرف اس سے کہیں زیادہ قرآن کریم سے لوگوں کا تعلق استوار کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ سے کہا گیا "کیا آپ حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی اسی طرح روایت کرتے تھے جس طرح اب کرتے ہیں؟" کہنے لگے "اگر میں حضرت عمرؓ کے عہد میں ایسا کرتا تو وہ ڈنڈے سے میری خبر لیتے۔"

کیا حضرت عمرؓ نے کثرتِ روایت کی بنا پر کسی صحابی کو قید کیا تھا؟ اس مقام پر حدیث کے بارے میں حضرت عمرؓ اور

دیگر صحابہ کے موقف سے متعلق ذیل کے دو سوالات کا جواب دے دینا ضروری ہے :-

۱- کیا حضرت عمرؓ نے کثرتِ روایت کی بنا پر کسی صحابی کو قید کیا تھا ؟

۲- کیا صحابہ کرام قبولِ حدیث کے لیے کچھ شرائط عائد کرتے تھے ؟

یہ مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ نے کبار صحابہ میں سے تین اصحاب، یعنی حضرت ابن مسعودؓ، ابو الدرداءؓ اور ابوذر غفاریؓ کو کثرت روایت کی بنا پر قید کیا تھا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ کسی معتبر کتاب میں مجھے یہ روایت مل جائے، لیکن میں ناکام رہا ہوں۔ اس روایت کا موضوع ہونا واضح ہے۔ ابن مسعودؓ ایک جلیل القدر صحابی اور سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ حضرت عمر کے دل میں ان کی بڑی وقعت تھی، حتیٰ کہ جب ابن مسعود کو انہوں نے عراق بھیجا تو اپنے اس فعل کا اہلِ عراق پر بطورِ ایک احسان کے ذکر کیا اور ان سے کہا "میں عبداللہ ابن مسعود کو اپنے پاس رکھنے کے بجائے تمہارے پاس بھیجنے میں بڑے ایثار سے کام لے رہا ہوں"۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ابن مسعودؓ عراق میں ممتاز پوزیشن کے مالک رہے۔ ان کو حضرت عمرؓ نے بھیجا ہی اسی لیے تھا کہ اہلِ عراق کو احکامِ کتاب و سنت سکھائیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انہیں کثرتِ روایت کی وجہ سے قید کیا گیا ہو ؟ جہاں تک حضرت ابوذرؓ اور ابو الدرداءؓ کا تعلق ہے، ان دونوں اصحاب سے اتنی احادیث مروی ہی نہیں ہیں کہ انہیں مکثرین میں شمار کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں ابو الدرداء بھی ابن مسعودؓ کی طرح شام میں مسلمانوں کے معلم تھے اور جو سوال آخر الذکر کے بارے میں پیدا ہوتا ہے، وہی اول الذکر کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ کیا حضرت عمرؓ یہ چاہتے تھے کہ یہ دونوں حضرات روایتِ حدیث سے اجتناب کریں تاکہ دین کے احکام مخفی رہ جائیں ؟ حضرت ابوذر سے جو احادیث منقول ہیں وہ حضرت ابوہریرہ کی روایت کردہ احادیث کا ایک معمولی جزو بنتی ہیں۔ تو پھر اگر ابوذرؓ کو محبوس کیا گیا تھا تو حضرت ابوہریرہ کو قید کرنا کہیں زیادہ ضروری تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابوہریرہ حضرت عمر کے ڈر سے روایت نہیں کرتے تھے، اس لیے انہیں قید نہیں کیا گیا تو پھر حضرت ابوذر کو حضرت عمرؓ کا خوف کیوں نہیں تھا ؟ مزید برآں اگر ابوذرؓ اتنی کثرت سے روایت کرتے تھے کہ انہیں اس سے باز رکھنے کے لیے قید کی حاجت پیش آئی، تو عہدِ ابوبکر و عمرؓ اور مابعد کے عہد کی مرویات کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہونا چاہیے تھا۔ صحابہ کرام میں سے حضرت ابنِ مسعود، ابن عباس، ابوہریرہ، جابر ابن عبداللہ

اور حضرت عائشہ کو کثیر الروایت تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر ان میں سے کسی ایک کی طرف سے بھی کوئی ایسی بات منقول نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت عمرؓ ان کو روایت حدیث سے روکتے تھے۔ بلکہ حضرت عمرؓ سے یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ جب حضرت ابوہریرہ نے لوگوں سے کثرت سے احادیث بیان کرنا شروع کر دیں تو حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ اُن سے کہا "کیا آپ فلاں مقام پر موجود تھے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ تھے؟"۔ انہوں نے جواب دیا "ہاں، اور میں نے آپ سے یہ یہ سنا تھا کہ جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ منسوب کیا اُس نے آگ میں اپنا ٹھکانا بنا لیا"۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اگر آپ کو یہ فرمانِ رسول یاد ہے تو پھر جائیے اور روایت کیجیے"۔ اب یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ کو چھوڑ دیا گیا ہو جو کثرت روایت میں جملہ صحابہ پر فوقیت رکھتے تھے اور ابن مسعودؓ اور ابوالدرداء جیسے صحابہ کو قید کر دیا گیا ہو، جن سے ابوہریرہؓ کی بہ نسبت بہت کم روایات منقول ہیں۔

میں نے اس روایت پر بہت غور کیا، اسے مختلف طریقوں سے جانچا، حتیٰ کہ ابن حزم کی کتاب الاحکام میں اس پر یہ تنقید میری نگاہ سے گزری:-

"حضرت عمرؓ کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہوں نے ابن مسعودؓ، ابوالدرداءؓ اور ابوذرؓ کو بربنائے اکثار حدیث قید کیا تھا۔ یہ روایت انقطاع سے مطعون ہے، کیونکہ اس کے راوی ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف کا حضرت عمرؓ سے سننا ثابت نہیں ہے۔ امام بیہقی نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا ہے۔ اگرچہ یعقوب ابن شیبہ اور طبری وغیرہ نے سماع کو ثابت کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سماع ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ راوی ننانوے ۹۹ یا پچانوے ۹۵ سن ہجری میں فوت ہوئے۔ ان کی عمر پچھتر برس کی تھی۔ اس حساب سے اُن کی پیدائش اواخر خلافت عمرؓ میں سنہ ۲۰ھ میں ہوئی۔ اس طرح حضرت عمرؓ سے ان کے سماع کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس بنا پر یہ روایت حجت و دلیل نہیں بن سکتی"۔ آگے چل کر ابن حزم لکھتے ہیں کہ "یہ روایت بنفسہٖ بھی کذب اور اختراع کا ایک نمونہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس سے ایک طرف تو صحابہ کرام پر اتہام ثابت ہوتا ہے اور یہ ایک نہایت سنگین بات ہے اور دوسری طرف اس سے حضرت عمرؓ کا تبلیغ سنت سے کبار صحابہ کو روکنا اور احکام دین کا اخفاء و انکار لازم آتا ہے، جو اسلام سے خروج کے مترادف ہے۔ معاذ اللہ! امیر المومنین

یہ کیسے کرسکتے تھے ؟ یہ بات تو کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اصحاب ثلاثہ مذکورہ اس سلسلے میں متہم نہیں تھے، تو پھر انہیں نظر بند کرنا صریح ظلم کی تعریف میں آتا ہے۔ بہرحال یہ خاسد روایت ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے "

کیا صحابہ قبولِ حدیث کے لیے کچھ شرائط رکھتے تھے ؟ اس دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام حدیث کے قبول کرنے میں یقیناً شروط کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں، جن میں سے چند یہاں نقل کی جاتی ہیں:-

(۱) تذکرۃ الحفاظ میں حافظ ذہبی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں لکھتے ہیں "آپ حدیث قبول کرنے میں سب سے زیادہ محتاط تھے۔ ابن شہاب نے قبیصہ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک بار ایک متوفی کی دادی ابوبکر صدیقؓ کے پاس آئی کہ اسے بھی ورثہ میں سے کچھ دیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ میں تیرا حصہ مقرر نہیں کیا گیا اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کچھ فرمایا ہے یا نہیں ؟ پھر آپ نے لوگوں سے اس بارے میں پوچھا تو مغیرہؓ نے کہا کہ آپؐ نے اسے ثلث کا حقدار بنایا ہے۔ خلیفہ اول نے دریافت کیا کہ کوئی اور بھی اس کا شاہد ہے ؟ محمد بن مسلمہ نے بھی اس کی شہادت دی۔ تب حضرت ابوبکرؓ نے اسے نافذ کر دیا"

(۲) حریری نے اسے نضرہ سے اور انہوں نے ابی سعیدؓ سے روایت کیا ہے کہ ابو موسیٰؓ نے حضرت عمرؓ کے دروازے کے باہر سے انہیں تین بار سلام کہا لیکن جب آپ نے جواب نہیں دیا تو واپس چلے گئے۔ حضرت عمرؓ نے آدمی بھیج کر انہیں بلوایا اور پوچھا کہ کیوں لوٹ گئے تھے ؟ حضرت ابو موسیٰ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جب کوئی تم میں سے تین بار سلام کہے اور اس کا جواب نہ ملے تو پھر اُسے لوٹ جانا چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اس پر کوئی ثبوت پیش کرو، ورنہ تمہاری خیر نہیں"۔ راوی کہتا ہے کہ ابو موسیٰ گھبرائے ہوئے ہمارے پاس آئے۔ ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا تھا کہنے لگے "تم میں سے کسی نے اس حدیث کو آنحضورؐ سے سنا ہے ؟" ہم نے کہا "ہاں ہم سب نے سنا ہے"۔ پھر ایک صحابی نے اُن کے ساتھ جا کر گواہی دی۔ یہ روایت مسلم میں بھی موجود ہے۔ (باقی صفحہ ۲۱۶ پر)

مطبُوعات

ریاض الاخلاق از حکیم محمد صادق صاحب فاضل السنۂ شرقیہ، دائرۂ تبلیغ، پورہ ہیراں، سیالکوٹ، ضخامت ۴۸۴ صفحات۔

اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت تقریباً چار سو ایسی احادیث نبوی یکجا کر دی گئی ہیں جو گھریلو زندگی اور عام مجلسی، معاشرتی اور تمدنی زندگی کے اسلامی آداب سکھاتی ہیں اور اجتماعی معاملات میں راست روی اور اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم دیتی ہیں۔ ہر حدیث کے ساتھ ترجمہ اور اُس کے مضامین و مطالب کی توضیح بھی کر دی گئی ہے اور ساتھ ساتھ بہت سی مروجہ بدعات کا ابطال بھی کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک احادیث کی جمع و ترتیب کا تعلق ہے، مؤلف کی محنت قابلِ داد ہے، لیکن کتاب کی زبان کے بارے میں یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ وہ بہت ناقص، مصنوعی، غیر مانوس اور اہلِ زبان کے محاورہ اور روزمرہ کے بالکل خلاف ہے اور اُس ذاتِ اقدس کے ارشادات کی ترجمانی و تشریح کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہے جو افصح العرب اور صاحب جوامع الکلم تھی۔ ترجمے کی زبان تو ایک حد تک گوارا ہے لیکن احادیث کے مضامین کی وضاحت میں مؤلف کے اشہبِ قلم نے جو جولانیاں دکھائی ہیں اُن کے صرف چند نمونے درج ذیل ہیں:۔

"جس حدیث کے ساتھ بزرگانِ زمانہ نے ہاتھ کر رکھا ہے (؟)، اس کے بیان کرنے سے پہلے ہمیں ایک آیت کے نورانی چہرے سے "غبارِ نفس" دور کرنا پڑے گا تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ عیار دو حدیثی کس طرح آیت کی کچکول میں ندروں نیازوں کی بھیک مانگتی پھرتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اب آپ قرآن کی دو آیتوں کا "توڑ موڑ" ملاحظہ فرمائیں، ریزہ ہائے الماس کا خزف و سفال سے تبادلہ ہوتا دیکھیں اور پھر سطرِ قرآن کی چلیپائی پر آنسو بہائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی حضرت مسجد میں لوہاروں، ترکھانوں، جولاہوں، موچیوں کے ساتھ مونڈھے سے مونڈھا (کندھے کے بجائے مونڈھے کا استعمال کتاب میں عام ہے) ملا کر کھڑے ہوں۔ یہ لوگ داورِ محشر کو کونسا منہ دکھائیں گے ۔ ۔ ۔ جھوٹ سے مسلمانی کی عمارت دھڑام سے زمین پر آ گرتی

ہے۔ اسلامیت کی کشتی کو کذب ضرور تار پیڈو کر کے چھوڑتا ہے۔ ٹھیک دروغ جان لیوا تے ایمان ہے ۔ ۔ ۔ زندگی کی منجدھار میں پاپوں بھری ناؤ میں بیٹھ کر دوسروں پر نکتہ چینی کرتا بن میکھ نکالتا ہے۔ اپنے مرُوّجات کی سیاہ رات میں ابنائے جنس کے کسوف زندگی پر سے حرف لاتا ہے، حالانکہ کسی سیاہ فام کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ سمن برور، کے خال رخ کی جسامت کے درپے ہو یا بال خورا کی روگن زہرہ جبینوں کے بکھرے بالوں پر اعتراض کرے ۔ ۔ ۔ آپ کی نسبت میں صرف اللہ ہی کو دکھانا سنانا پیوست ہو۔ عبادات کی خُوروشوں اور حسنات کی عذراؤں کو کوئی غیر محرم نہ دیکھے ۔ ۔ ۔ اگر کسی جبین بھائی ذہن کو کتاب میں ہر جگہ بھین لکھا گیا ہے) دوست، یار اور رشتہ دار وغیرہ کے گھر جانے کا اتفاق ہو تو شباشب اللہ نہیں چلے جانا چاہیے۔ لجاجیت کے مسموم جھونکوں سے خودی کا عطر بیز پھول مرجھا کر جل جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اولاد کے حسن و شباب اور بلندیوں کا شاہیں والدین کی آرزوؤں کے بے شمار طیور و عصافیر نوچ کر اڑنا سیکھتا ہے ۔ ۔ ۔ ہم لیاقت کی ڈینگیں تو بہت مارتے ہیں لیکن کردار کے لحاظ سے انسانیت بہت اونچی ہے۔ بڑے بڑے بزرگوں کے حال اور عوام کے ان کے ساتھ سابقے اس پر شاہد ہیں کہ علم و ورع کے چشمے کے ارد گرد بد اخلاقی کے مار و کژدم کچھ اس طرح پھنکارتے ہیں کہ کوئی رستم کے سگے کا ماں کا جایا بھی قریب نہیں پھٹک سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ نکل نکانا (یعنی اُتارنا) غنیمت ہے"

کہاں تک لکھا جائے۔ پھر بعض عبارتیں تو اتنی رکیک ہیں کہ اُن کے نقل کرنے سے بھی طبیعت ابا کرتی ہے۔ کہاں حدیث کی سلیس، بے ساختہ اور دل آویز زبان کہ جسے پڑھتے ہوئے شدتِ تاثر سے کبھی آنکھیں آنسو بہانے لگتی ہیں اور کبھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے لگتے ہیں اور کہاں اُن کی تشریح و تفسیر کے لیے ایسی زبان جس کا پڑھنا بھی ذوقِ سلیم پر بار ہے۔ کاش کہ السنۂ شرقیہ کے فضلاء اردو زبان کی اہمیت اور شستہ طرزِ تحریر و تقریر کی ضرورت کو کماحقہٗ محسوس کریں تاکہ اُن کی ہر بات قولِ بلیغ کا صحیح نمونہ ہو۔

اربعین نووی | تالیف حافظ نذر احمد صاحب و مولانا عزیز زبیدی صاحب، ناشر علمی کتب خانہ اردو بازار لاہور۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

علماء حدیث کا ایک پرانا قاعدہ چلا آرہا ہے کہ اُن میں سے بعض حضرات چالیس جامع اور مختصر

احادیث کا مجموعہ منتخب کرتے ہیں، جسے اربعین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہی مجموعوں میں سے ایک مجموعہ اربعین نووی ہے۔ امام یحییٰ بن شرف الدین نووی ساتویں صدی ہجری کے مشہور محدث اور شارح حدیث ہیں، انہوں نے اپنے اس مجموعے میں بہت خوبی سے دینی عقائد، ارکان، اخلاق اور اعمال سے تعلق رکھنے والی احادیث کو جمع کر دیا ہے۔ مترجمین نے صرف احادیث کے متون و تراجم دینے پر اکتفا نہیں کی بلکہ کتاب کے شروع کے دو تہائی حصے میں حدیث کی ابتدائی تدوین، مصطلحات و اقسام حدیث، ائمہ حدیث، اصحاب صحاح ستہ، راویان احادیث اربعین نووی اور امام نووی کے بارے میں بھی ضروری اور مفید معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس طرح سے اس کتابچے کی جامعیت و افادیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ | افادات شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔ مترجمہ مولانا صدر الدین اصلاحی۔ شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ رام پور۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ۔

ہماری تاریخ کا ایک اہم ترین مسئلہ وہ اختلافات ہیں جو فرقے بنانے کا موجب ہوئے۔ اس مسئلے پر جس بہترین تحقیقی و تفہیمی انداز میں شاہ ولی اللہؒ نے اپنے افادات سپرد قلم فرمائے ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت دین نام کس چیز کا ہے۔ اس بحث کو مولانا صدر الدین اصلاحی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اول اول ایک سلسلۂ مقالات کے طور پر یہ بحث خود ماہنامہ ترجمان القرآن میں شائع ہوئی تھی۔ اب یہ نظر ثانی کے بعد مرتب ہو کر کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

شاہ صاحب نے بڑی وسعت نظر کے ساتھ اختلافات کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے اور اُن کے نشوو ارتقاء کو مختلف دوروں میں تقسیم کر کے بیان فرمایا ہے۔ کتاب پڑھتے ہی جیسے ساری تاریخ کھل کر سامنے آجاتی ہے اور ایک بلندی سے بیٹھ کر اُمت کے قافلۂ افکار کو بیک نظر بارہ صدیوں کا سفر کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے شاہ صاحب کا علم ساتھ ساتھ واضح کرتا جاتا ہے کہ کہاں سے یہ قافلہ جادۂ اعتدال سے ہٹتا ہے اور کہاں کہاں سے غلط موڑ مڑتا ہے اور پھر کس طرح فرقہ واریت اور گروہی تعصبات کے نشیب و فراز اس کے سامنے حائل ہو جاتے ہیں اور وہ ٹکڑیوں میں بٹتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر ایک مسلمان کی نظر میں وہ توسع پھر لوٹ کر آجاتا ہے جسکو

کرنے کے بعد لوگ مسلم ہونے سے زیادہ اہمیت "کچھ اور" ہونے کو دیتے ہیں۔ ان سارے مفاسد کا ٹھیک ٹھیک تصور آدمی کرسکتا ہے جنہوں نے اختلاف کو امت کے لیے موجب رحمت و برکت ہونے کے بجائے موجب مصیبت و ہلاکت بنا دیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کتاب اختلافی مسائل کے بارے میں گم شدہ راہِ عدل کا پھر پتا دے دیتی ہے۔

مترجم صاحب علم آدمی ہیں اور ان کا قلم استدلال اور جذبات دونوں جوہروں سے مالا مال ہے۔

صلوٰۃ الرسول | از جناب مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی۔ ناشر: دائرۃ التبلیغ پورہ میراں۔ سیالکوٹ قیمت نامعلوم۔

مسلمان کی عبادات اور اس کے معاملات کے تابع اسلام ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اسوۂ نبوی ؐ سے پوری طرح اکتسابِ فیض کرے۔ نماز جو اتم العبادات ہے اس کے بارے میں تو خصوصیت کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ (بخاری)، نماز اس طریق پر پڑھو جیسے مجھے پڑھتے دیکھتے ہو۔ دوسرے لفظوں میں لازم یہ ہے کہ وضو، طہارت، ترتیب ارکان، اوقات، جماعت، خشوع و خضوع کے تقاضوں میں سے ہر امر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا پورا عکس اپنے اندر پیدا کیا جائے۔ اس معاملے میں یہ حقیقت افسوسناک ہے کہ نمازی تھوڑے بہت ملتے بھی ہیں تو اسلام کی اس بنیادی عبادت کے بارے میں نبی صلعم کا نمونہ و اسوہ جاننے والے شاذ ہی کہیں پائے جاتے ہیں۔ یہ کتاب اسی مقصد سے لکھی گئی ہے کہ رسول اللہ صلعم کا طریق نماز ہر پہلو سے اردو داں عوام کے سامنے واضح ہوسکے۔ یہ کتاب درحقیقت ایک عام ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ کتاب اہلِ حدیث کے زاویۂ نظر سے لکھی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ فاتحہ خلف الامام اور آمین بالجہر وغیرہ مسائل پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ان معاملات میں مختلف مسلکوں کو بیان کر دیا جاتا اور مولف آخر میں اپنا ذاتی رجحان واضح کر دیتے کہ کس مسلک کی طرف ہے۔

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ | مرتبہ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ۔ ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ۔ قیمت بلاجلد عمر

مولانا محمد الیاس مرحوم سے آج دینی حلقوں کے ساتھ وابستگی رکھنے والا کون سا فرد ناواقف ہوگا۔ کسی حد تک ان کی دعوت کا چرچا بھی ہر جگہ پہنچ چکا ہے۔ لیکن مرحوم جس طرزِ فکر اور جس سیرت سے آراستہ تھے اس سے کم ہی لوگ آشنا ہونگے۔ مولانا نعمانی نے ملفوظات لکھ کر یہ آسانی بہم پہنچا دی ہے کہ اس کتاب کے ذریعے اس فکر و سیرت کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے جس سے مولانا الیاس مرحوم کی ذات آراستہ تھی!

پیارے رسولؐ | از جناب افضل حسین صاحب ایم اے، بی اے، بی ٹی۔ ناظم درسگاہ جماعت اسلامی ہند رام پور۔ شائع کردہ:۔ مکتبۂ جماعت اسلامی ہند رام پور۔ قیمت ۵ر۔

یہ رسالہ بچوں کے لیے لکھا گیا۔ اس میں نہایت ہی آسان زبان اور دلچسپ انداز بیان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ایک عکس پیش کیا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ابواب میں آنحضورؐ کی زندگی اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اُس دعوت، اُس مقصد اور اُس تحریک کا تصور بھی بچوں کو حاصل ہو سکتا ہے جس کے لیے حضورؐ کی زندگی پوری کی پوری وقف تھی اور جس کے لیے آپؐ نبی بنا کر اٹھائے گئے تھے۔

آخری حصہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے فرمودات انتخاب کر کے درج کئے گئے ہیں جن سے بچوں کو زمانۂ تربیت میں استفادہ کرنا چاہیے۔

پھلوں سے علاج | از جناب حکیم محمد عبد اللہ صاحب گولڈ میڈلسٹ (روڑی والے) شائع کردہ شیخ محمد قمر الدین تاجر کتب گجر گلی اندرون موچی دروازہ، لاہور۔ قیمت درج نہیں۔

حکیم محمد عبد اللہ صاحب نے معالجہ کے فن میں جو دلچسپ سلسلۂ کتب لکھا ہے، یہ اس کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں موصوف نے اپنے مطالعے اور تجربے کا گویا نچوڑ پیش کیا ہے۔ ایک معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی اس کے مطالعہ سے یہ جان سکتا ہے کہ مختلف امراض میں کس پھل کو کس طریقے پر استعمال کرنے سے شفا حاصل ہو سکتی ہے۔

(بقیہ اشارات)

اس دوطرفہ اعتراف کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ دونوں عناصر ایک دوسرے سے استفادہ کرنے پر تیار ہو جائیں اور تعاون کے ساتھ ایک نظام زندگی کو چلا سکیں۔

حال ہی میں یہ بحث چھیڑ دی گئی ہے کہ اسلامی نظام تو ہو گا مگر اسلام کی تعبیر Interpretation کا حق کوئی وجہ نہیں کہ ملا کو حاصل رہے، یہ حق تو ہر مسلمان کے لئے عام ہے۔ اس بحث کے ذریعے پھر اسی جھگڑے اور نفرت کی ذہنیت کے ساتھ جدید طبقے کو اس بات پر اکسانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب اسلام میں پریسٹ ہڈ (Priesthood) سرے سے ہے ہی نہیں تو ملا کی طرف دیکھنے کی ضرورت کیا ہے، کیوں نہ تم خود بڑھ کر اسلام کی تعبیر کا منصب سنبھال لو اور پھر من مانے طریق سے جو چاہو کرو۔

سوال یہ ہے کہ کیا واقعی اس معاشرے میں آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اسلام کی کوئی ایسی تعبیر اسلام کے نام سے چلائی جا سکتی ہے جس کو عوام کا ذہن قبول کرنے کے لئے آئندہ دس سال میں بھی تیار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً "قطع ید" کی سزا کی یہ جدید تعبیر کہ اس کے معنی ہاتھ کاٹنا نہیں، بلکہ چور کے ہاتھ کو چوری کے لئے بے کار (Disable) کر دینے کے ہیں، چاہے یہ مقصد قید سے حاصل ہو، یا ضمانت لینے سے یا کسی اور طرح سے۔ کیا اس معاشرے کے عوام سے سندِ قبول پا سکتی ہے؟ کیا یہ اجتہاد یہاں عملاً چل سکتا ہے کہ اللہ نے تو صرف لحمِ خنزیر کو حرام کیا ہے، اس کے بال حرام نہیں ہیں اور ان سے برش بنا کر دودھ کی بوتلیں صاف کی جا سکتی ہیں؟ — آپ ایک غیر اسلامی نظام کے تحت تو جو کچھ کر لیں۔ لیکن اسلامی نظام کے تحت آپ اس طرح کی تعبیرات اور اجتہادات کو ہرگز نہیں چلا سکتے۔ اسلام کے بارے میں عوام کا سارا اعتماد اب تک اسی تعبیر پر ہے جو آپ کا معتوض "ملا" پیش کرتا ہے۔ لوگ آج بھی اپنے دینی معاملات میں خواجہ ناظم الدین اور غلام محمد صاحب کی طرف فتوے حاصل کرنے کے لئے رجوع نہیں کرتے، اور آئندہ بھی وہ ان سے اپنا دین پوچھنے پر تیار نہیں ہو سکتے۔ بس اس طرح کی کوششیں بالکل فضول ہیں۔

اسلام میں پریسیٹ ہڈ بلاشبہ نہیں ہے بلکہ یہاں ہر مسلمان کے لئے علم دین کے دروازے کھلے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج جو قانونی نظام چل رہا ہے اس کی مہارت حاصل کرنا کسی خاص خاندان اور طبقے کا اجارہ نہیں ہے۔ لیکن عملاً یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص کسی نظام کا محقق و ماہر بن سکے۔ عملاً تقسیم کار کے اصول کے تحت ناگزیر ہے کہ کچھ لوگ ایک خاص میدان میں ماہرین کی حیثیت سے کام کریں اور معاشرہ اس میدان میں انہی کی طرف رجوع کرے۔ چنانچہ آج بھی آپ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ چونکہ وکالت کسی طبقے کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر شخص کو قانون کی تعبیر کا حق حاصل ہے لہٰذا ہم اپنے معاملات میں قانون کی تعبیر خود کریں گے اور جس طرح چاہیں گے کریں گے۔ بالکل اسی طرح اسلام میں تعبیر کا حق کسی خاندان اور طبقے کے لئے مخصوص نہیں ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص کو حق حاصل ہو گیا کہ وہ اسلام کی تعبیر کے منصب پر براجمان ہو کر اجتہاد کرنے لگے۔ تعبیر و اجتہاد کا حق جو بھی چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام کا ماہرانہ علم حاصل کرے دروازے کسی کے لئے بند نہیں ہیں۔ مگر ماہرانہ علم کے بغیر تعبیر و اجتہاد کا ادعا بڑی مضحکہ انگیز اور جاہلانہ حرکت ہے۔

اس منزل کے آجانے سے پہلے، کہ ہمارے معاشرہ کے دونوں عناصر گھل مل کر بالکل ایک ہو جائیں اور ہمارا ایک ہی نظام تعلیم ایسے افراد تیار کرنے لگے جو جدید دور میں نظام تمدن کو چلانے کی مہارت کے ساتھ ساتھ بیک وقت دین کا ٹھوس علم بھی رکھتے ہوں، موجودہ عبوری مرحلے میں یہ ناگزیر ہے کہ یہ دونوں عناصر ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ ملک کی پارلیمنٹ ہو، کیبنٹ ہو، تعلیمی نظام ہو، یا کسی اور شعبے کو چلانے والا ادارہ ہو، موجودہ حالات میں کوئی چارہ کار اس کے سوا نہیں ہے کہ دونوں عناصر کے بہترین افراد باہم سر جوڑ کر سوچیں اور پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے عمل کی شاہراہ پر بڑھیں۔ جدید طبقے کو واسطہ ہونا چاہئے مذہبی عنصر کے لئے جدید مسائل کے علم و فہم کا، اور مذہبی عنصر کی تعبیر دین کو قبول کرنا چاہئے جدید عنصر کو!

یہ ہے طریقہ اس سرزمین پر اسلامی نظام کے عملاً برپا ہونے کا ——— اور یہ نہ اختیار کیا گیا تو پھر

کشمکش بہرحال درپیش ہے اور اس کشمکش میں چاہے برسراقتدار اقلیت اپنی آئینی اور معاشی پوزیشن کے بل پر کچھ دیر اور پنپ جائے ۔ لیکن عوامی اکثریت کی اٹھائی ہوئی تحریک کا سیلاب بالآخر اس کو بہا لے جائے گا ۔ آج یہ اقلیت رائے عام کا احترام کر کے اپنا مستقبل جتنا کچھ بچا سکتی ہے ، اس کے خلاف کشمکش چھیڑ دینے کے بعد پھر اتنا بھی محفوظ رہنا مشکل ہو جائیگا !

پس جدید عنصر کو ہم خیر خواہی کے ساتھ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ چند اقتدار پسند افراد کے اٹھائے ہوئے بادِ ہوائی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو تعصب میں مبتلا نہ کرے ، حقائق کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنا مستقبل اسلام اور اسلام کو چاہنے والی عوامی اکثریت کے ساتھ وابستہ کرے ۔

(بقیہ سنت رسولؐ صفحہ ۲۰۸)

(۳) ہشام نے اپنے باپ سے اور انہوں نے مغیرہ بن شعبہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے عورت کے حمل ساقط کیے جانے کے متعلق پوچھا تو مغیرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر دیت عائد کی ہے ۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر یہ سچ ہے تو ایک گواہ لاؤ ۔ مغیرہ کہتے ہیں کہ محمد ابن مسلمہ نے آکر شہادت دی کہ آپؐ نے ایسا ہی فیصلہ فرمایا تھا ۔

(۴) اسماء بن حکم الفزاری سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت علی سے سنا کہ جب میں کسی سے آپ کی حدیث سنتا تو اس سے حلف لیتا ۔ جب وہ حلف اٹھا لیتا ، تب میں اسے تسلیم کرتا ۔"

Missing

Missing